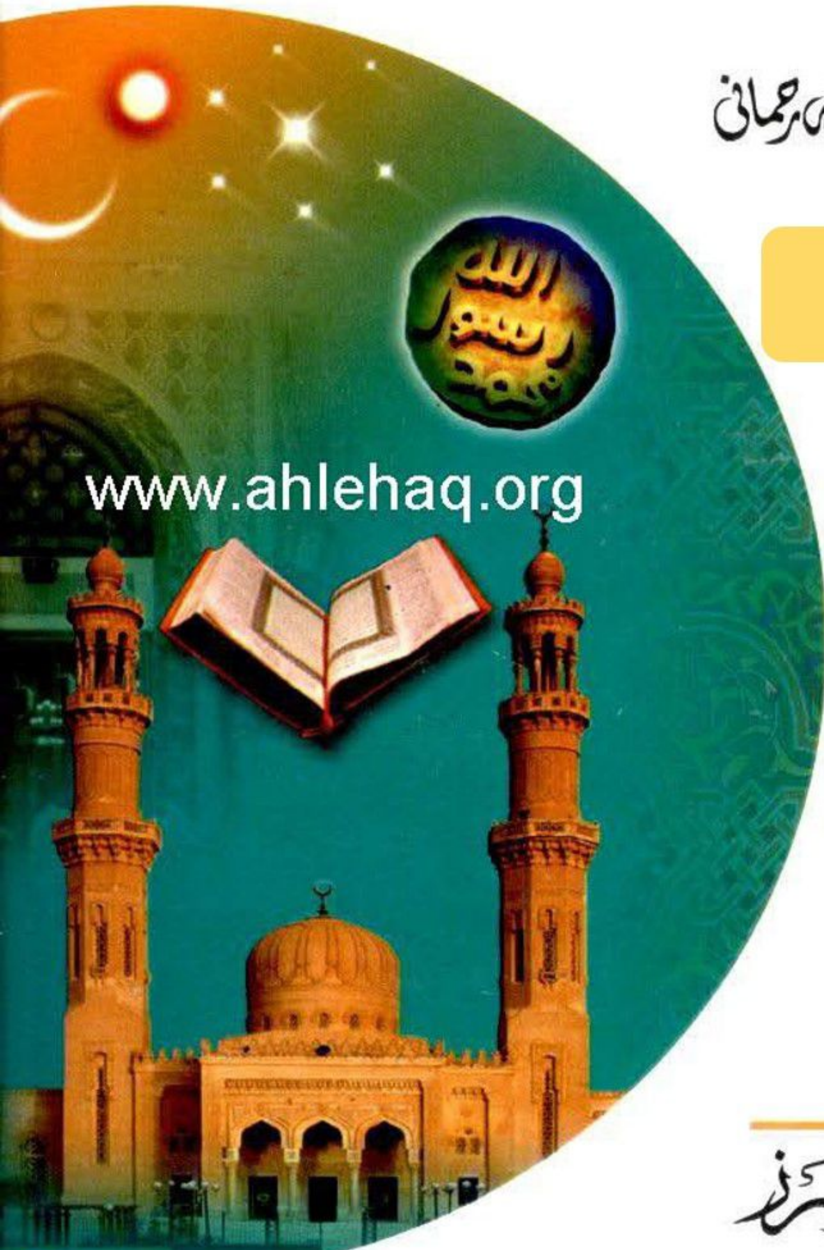
راہِ عمل

۱۔ نقوشِ موعظت
۲۔ حقائق اور غلط فہمیاں
۳۔ نئے مسائل، اسلامی نقطۂ نظر

تالیف
مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

جلد دوم



زمزم پبلشرز

راہِ عمل ۲

حقائق اور غلط فہمیاں

جس میں اسلام اور شریعتِ اسلام سے متعلق ملکی
وعالمی سطح پر پھیلی ہوئی غلط فہمیوں اور پروپیگنڈوں
کا سنجیدہ جائزہ لیا گیا ہے اور اسلام کی حقیقی تعلیمات
اور اس کی عقل و فطرت اور حکمت و مصلحت سے
ہم آہنگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تالیف
مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

ناشر
زمزم پبلشرز
نزد مقدس مسجد اُردو بازار کراچی

کتاب کا نام ——— راہِ عمل حقائق و غلط فہمیاں

تاریخ اشاعت ——— جون ۲۰۰۹ء

مطبع ——— احباب زمزم پبلشرز

ناشر ——— زمزم پبلشرز کراچی

شاہ زیب سینٹر نزد مقدس مسجد، اردو بازار کراچی

فون: 021-2760374

فیکس: 021-2725673

ای میل: zamzam01@cyber.net.pk

ویب سائٹ: http://www.zamzampub.com

ملنے کے دیگر پتے

- دار الہدیٰ اردو بازار کراچی۔ فون۔ 2726509
- دار الاشاعت، اردو بازار کراچی
- قدیمی کتب خانہ بالمقابل آرام باغ کراچی
- مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار لاہور

Madrassah Arabia Islamia
1 Azaad Avenue P.O Box 9786-1750
Azaadville South Africa
Tel : 00(27)114132786

AL FAROOQ INTERNATIONAL
68, Asfordby Street Leicester LE5-3QG
Tel : 0044-116-2537640

ISLAMIC BOOK CENTRE
119-121 Halliwell Road, Bolton
BI1 3NE U.S.A
Tel/Fax : 01204-389080

Azhar Academy Ltd.
54-68 Little Ilford Lane
Manor Park London E12 5QA
Phone: 020 8911 9797

فہرست مضامین

☆ پیش لفظ ۵

☆ عرض مرتب ۷

☆ لا تبدیل لکلمات اللّٰہ! ۹

☆ قرآن مجید اور دہشت گردی ۱۴

☆ ۲۴ آیتیں ۲۰

☆ اسلام — صلح و آشتی کا مذہب ۶۲

☆ اسلام کا تصور جہاد ۶۷

☆ جہاد — حقیقت اور فسانہ ۷۳

☆ اسلام — دینِ اعتدال ۷۹

☆ مجسمہ کا انہدام — غور و فکر کے چند پہلو ۸۵

☆ کیا کافر کہنا توہین ہے؟ ۹۱

☆ مذہب کی تبدیلی ۹۷

☆ اسلام اور غیر مسلم ۱۰۳

☆ غیر مسلموں سے تعلقات ۱۰۹

☆ فاصلے کیوں کر گھٹیں گے؟ ۱۳۶

☆ دہشت گردی کا مسئلہ — حقیقت پسندانہ تجزیہ ۱۴۱

☆ مسلم پرسنل لا: ایک غلط فہمی کا ازالہ ۱۴۷

☆ یونیفارم سول کوڈ — حقیقت پسندانہ جائزہ! ۱۵۱

☆ عورت اور اسلام ۱۵۵

☆ کم عمری کی شادی ۱۶۳

☆ تعدد ازدواج کا مسئلہ ۱۶۹

☆ طلاق، اسلامی نقطۂ نظر ۱۷۵

☆ نفقۂ مطلقہ کا مسئلہ ۱۸۰

☆ پردہ — حفاظت نہ کہ قید ۱۸۶

☆ عبادت گاہوں کا احترام اور اسلام ۱۹۲

☆ زنا کی سزا — موجودہ سماجی ماحول میں ۱۹۷

☆ ذبحِ حیوان — حقائق اور غلط فہمیاں ۲۰۳

☆ قانون شریعت، رحمت نہ کہ زحمت ۲۰۷

پیش لفظ

۱۹۹۸ء سے روزنامہ منصف حیدرآباد نئی اور خوشگوار تبدیلیوں کے ساتھ اور نئی انتظامیہ کے تحت شائع ہونے لگا، اس موقع سے اخبار کے منتظمین نے اس حقیر سے خواہش کی کہ ہر جمعہ کو اخبار کے لئے ایک خصوصی کالم لکھا کروں اور اس کو ''شمع فروزاں'' کا عنوان دیا گیا، چوں کہ اخبار کی رسائی کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے، اور عوام وخواص، مرد وخواتین، چھوٹے اور بڑے بھی اس سے استفادہ کرتے ہیں اور اگر صحیح استعمال ہو تو یہ خیر کی اشاعت کا بہت بڑا ذریعہ ہے، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے راقم الحروف نے اس پیش کش کو قبول کرلیا۔

چنانچہ شروع سے آج تک ہر جمعہ کو یہ کالم اس حقیر کے قلم سے ہوتا ہے، جس میں کوشش کی جاتی ہے کہ پیش آنے والے نئے حالات اور تازہ واقعات کے پس منظر میں اسلامی نقطۂ نظر کو واضح کیا جائے، تاکہ لوگ محسوس کریں کہ یہ ایک زندہ اور زندگی سے مربوط مذہب ہے، اس کالم کے تحت ان غلط فہمیوں کو بھی دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جو اسلام سے متعلق پیدا کی جارہی اور پھیلائی جارہی ہیں۔ عام لوگوں کی استعداد اور ان کے معیار کو سامنے رکھتے ہوئے ان مضامین میں خالص علمی وتحقیقی انداز اختیار کرنے کے بجائے تذکیری اور دعوتی رنگ کو غالب رکھا جاتا ہے اور اس رنگ میں کوشش کی جاتی ہے کہ علمی دلائل بھی آجائیں، چنانچہ ۱۹۹۹ء سے لے کر ۲۰۰۲ء تک جو مضامین شائع ہوئے، ان میں سے اسلام سے متعلق غلط فہمیوں کے ازالہ پر مبنی تحریروں کا یہ مجموعہ ''حقائق اور غلط فہمیاں'' اشاعت پذیر ہورہا ہے۔

شمع فروزاں کالم کے تحت شائع ہونے والے مضامین کو محفوظ رکھنے کا جو اہتمام ہونا چاہیے تھا، افسوس کہ نہیں ہوسکا اور بعض مضامین باوجود تلاش بسیار کے نہیں مل پائے، لیکن جو کچھ مضامین دستیاب ہوئے، اس کے لئے عزیزی مولوی محمد نعمت اللہ قاسمی سلمہ شکریہ کے مستحق ہیں، انہوں نے بڑی محنت سے جن مضامین کی زیراکس کاپی محفوظ تھی، ان کو تاریخ کے لحاظ سے مرتب کیا، پھر جو مضامین نہیں مل سکے، ان کے لئے مختلف جگہ سے اخبارات جمع کرنے کی کوشش کی اور بڑی حد تک مضامین کو اکٹھا بھی کرلیا، اس کے بعد چند ہی مضامین ہیں، جو حاصل نہیں کئے جاسکے، پھر انہوں نے ان مضامین کو موضوع کی مناسبت سے الگ

الگ مجموعوں کی شکل دی، جن میں سے ایک اس وقت آپ کے سامنے ہے، اللہ تعالیٰ عزیزی سلمہ کو جزائے خیر عطا فرمائے، ان سے دین اور علم دین کا زیادہ سے زیادہ کام لے، اور اس حقیر مجموعہ کو شکوک و شبہات کے ان کانٹوں کو نکالنے میں مفید و مؤثر بنائے، جو مغرب کی جانب سے بوئے جارہے ہیں، وہ مغرب جو اونٹ کو نگلتا اور مچھر کو چھانتا ہے اور جو شیش محل میں بیٹھ کر دوسروں پر پتھر برسانے کا عادی ہے۔

و باللہ التوفیق وھو المستعان .

۲۲/رجب ۱۴۲۵ھ

خالد سیف اللہ رحمانی

۷/ستمبر ۲۰۰۴ء

(خادم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)

عرضِ مرتب

اس دنیائے بے ثبات میں حق و باطل اور خیر و شر کا معرکہ ہمیشہ سے گرم رہا ہے، جب بھی حق نے اپنی چادرِ رحمت کو پھیلایا، باطل نے اس کا پیچھا کیا، انبیاء کرام کی تاریخ اس معرکہ سے بھری پڑی ہے، کہ جب بھی کسی نبی نے راہِ حق کی طرف لوگوں کو دعوت دی، لوگوں نے اس کا انکار کیا اور غلط فہمیاں پھیلا کر قبولِ حق سے لوگوں کو باز رکھا، اسلامی تاریخ کو بھی اس طرح کی کشمکش کا سامنا رہا ہے، چنانچہ آج بھی غلط فہمیاں پیدا کرنے والوں کی نمائندہ تحریکیں زیادہ منظم اور منضبط طور پر اپنی تخریبی کاروائیوں میں دن و رات مشغول ہیں، اور جہاں مستشرقین نے مغرب میں اسلام کے متعلق غلط فہمیاں اور بے جا اعتراضات پھیلانے کا سہرا اپنے سر لیا ہے، وہاں ایشائی ممالک میں بھی ان کے زیرِ اثر بہت سی تنظیمیں اس سلسلہ میں سرگرمِ عمل ہیں، ہندوستان کے پس منظر میں وشوہندو پریشد اور آر۔ ایس۔ ایس والے اس سلسلہ میں جو کردار ادا کر رہے ہیں، وہ اہلِ علم کی نظروں سے مخفی نہیں۔

ان اسلام مخالف غلط فہمیوں کو ہوا دینے میں مغربی تہذیب وثقافت کا خاصا رول رہا ہے، کیوں کہ مغربی تہذیب جس راہِ حیات کی حامل ہے، وہ اسلام کی مذہبی قدروں اور انسانی فطرتِ سلیمہ کے مغائر ہے۔ پردہ، طلاق، تعدادِ ازدواج، عورتوں کے حقوق اور دائرہ کار ان موضوعات میں سے ہے، جو اس وقت اسلام کے خلاف مغرب کی یلغار کا خاص موضوع ہے، ان کی سوچ میں تضاد اور عملی بھی ہے، وہ ایک طرف عورتوں کے خلاف ہونے والے مظالم کے مقابلہ آواز بھی بلند کرتی ہیں اور دوسری طرف عورتوں کی عصمت ریزی پر عائد ہونے والی سزاؤں پر احتجاج سے بھی گریز نہیں کرتیں اور قرآن نے جو اس سلسلہ میں زنا کی سزا متعین کی ہے، اسے عقلِ انسانی کے خلاف اور انسانی تکریم کے مغائر سمجھتی ہیں۔

آج جب کہ بھی میڈیا نے اسلام اور مسلمان مخالف جذبات کو ہوا دینا اپنا خاص مشغلہ بنا رکھا ہے، ان حالات میں اگر کوئی غلط فہمی ان کے ہاتھ آجائے تو اسے وہ اپنا کمال سمجھتے ہیں اور اس کی نشر و اشاعت میں اپنی پوری کوشش صرف کر دیتے ہیں، ظاہر ہے ان غلط فہمیوں کا ازالہ علماء کی ایک اہم ذمہ داری ہے، جس کے لئے ان کے اندر علمی گہرائی و گیرائی کے ساتھ ساتھ موجودہ زمانہ کے اندازِ فکر اور مسائل کو مصالحِ شریعت اور عقلِ انسانی سے ہم آہنگ کر کے پیش کرنے کی صلاحیت درکار ہے۔

حضرت الاستاذ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ (ناظم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد و جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا) کو اللہ تعالیٰ نے جہاں فقہ اسلامی میں مہارت اور شانِ امتیاز عطا کیا ہے، وہیں احکامِ شریعت کی مصلحتوں اور فطرتِ انسانی اور عقل سلیم سے ان کی ہم آہنگی پر بھی ان کی گہری نظر ہے، نے اپنی توجہات کا مرکز ان غلط فہمیوں کو بھی بنایا اور اسلام کے خلاف پیدا جانے والی غلط فہمیوں کا شریعتِ اسلامی اور انسانی عقل سلیم کے تناظر میں مثبت اور دلچسپ انداز میں جواب دیا ہے اور جہاد، تعداز دواج، پردہ، طلاق، ذبح حیوان، یونیفارم سول کوڈ، تبدیلی مذہب جیسے اہم موضوعات ــــ جن کے بارے میں عام طور پر غلط فہمیاں پھیلائی جاتی ہیں ــــ پر مدلل اور بصیرت مندانہ گفتگو کی ہے، تقریباً چھ سالوں سے آپ ہندوستان کے کثیر الاشاعت اُردو روزنامہ '' منصف '' حیدرآباد کے جمعہ ایڈیشن '' مینارۂ نور '' میں '' شمع فروزاں '' کے عنوان سے ہر ہفتہ سماجی، سیاسی، نئے مسائل اور اسلام کے خلاف پھیلائی جانے والی غلط فہمیاں جیسے موضوعات پر اپنا مضمون سپردِ قلم کرتے ہیں، زبان و بیان کی سلاست و شگفتگی اور رعنائی نیز عام فہم ہونے کی وجہ سے یہ مضامین عوام و خواص میں یکساں طور پر مقبول ہیں؛ اس لئے عام دنوں کے مقابلہ جمعہ ایڈیشن خاصی زیادہ تعداد میں شائع ہوتا ہے، یہ مجموعہ روزنامہ منصف میں شائع شدہ ان ہی مضامین کا گلدستہ ہے، احقر نے روزنامہ منصف کی فائلوں سے ان مضامین کو جمع کیا، جو یقیناً احقر کے لئے باعثِ سعادت ہے، جس سے عملی زندگی میں احقر نے بہت ہی فائدہ بھی محسوس کیا اور اب افادۂ عام کی غرض سے اسے کتابی شکل میں شائع کیا جارہا ہے، اس مجموعہ میں مولانا مدظلہ کا ۲۴ آیتیں نامی رسالہ بھی شامل ہے، جو اصل میں وی۔ ایچ۔ پی والوں کی طرف سے قرآن مجید کی جن ۲۴ رآیتوں کو نشانہ بنایا گیا ہے، اس کا جواب ہے، جو روزنامہ منصف میں ہی پہلی بار سات قسطوں میں شائع ہوا تھا، اس کا ہندی اور گجراتی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ کتاب اسلام کے خلاف پھیلائی جانے والی غلط فہمیوں کے ازالہ کا سبب بنے، اس کا نفع زیادہ سے زیادہ عام ہو اور یہ حقیر کوشش مصنفِ کتاب حضرت الاستاذ مدظلہ کے ساتھ ساتھ احقر کے لئے بھی ذخیرہ آخرت بنے۔

۲۲/ رجب ۱۴۲۵ھ

محمد نعمت اللہ قاسمی

۸/ ستمبر ۲۰۰۴ء

(ڈپلوما ان انگلش المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد)

لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمَاتِ اللّٰہ!

حال ہی میں وی، ایچ، پی لیڈر گری راج کشور کا نہایت ہی مذموم، غیر ذمہ دارانہ اور اشتعال انگیز بیان آیا ہے کہ قرآن وحدیث کے مضامین میں تبدیلی ہونی چاہئے، اور بقول ان کے جن آیات واحادیث میں غیر مسلموں سے نفرت کی تعلیم دی گئی ہے، اُن کو نکال دینا چاہئے، یہ بیان نامعقول بھی ہے، اور ناشائستہ بھی، ناشائستہ اس لئے کہ یہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے اور ان کے مذہبی مآخذ پر حملہ کرنے کے مترادف ہے، نامعقول اس لئے کہ کسی بھی تحریر و بیان میں صاحبِ تحریر ہی کو تبدیلی کا حق حاصل ہوتا ہے، ایسا نہیں ہوسکتا کہ ایک شخص کوئی بات کہے، اور دوسرا شخص اس بات کو واپس لے لے، اس سے قطعِ نظر کہ مسلمان قرآن کو اللہ کا کلامِ حق ترجمان اور حدیث کو منشاءِ ربانی کا بیان سمجھتے ہیں، خالص عقلی نقطۂ نظر سے بھی یہ نہایت ہی نامعقول بات ہوگی، لیکن اس قسم کے غیر دانشمندانہ مطالبات مسلمانوں کے لئے کوئی اچنبھے کی چیز نہیں ہیں۔

جس عہد میں قرآن مجید نازل ہوا، اس وقت بھی مشرکین نے یہی مطالبہ کیا تھا، اور رسول اللہ ﷺ کی زبانی یہی جواب دلایا گیا تھا کہ ہماری کیا مجال کہ ہم قرآن کو بدل دیں، یا ہم اپنی طرف سے کوئی بات لے آئیں، ارشاد ہے:

> جب ان پر ہماری آیتوں کی تلاوت کی جاتی ہے، جو واضح ہیں، تو جن لوگوں کو (آخرت میں) ہماری ملاقات کا یقین نہیں ہے، وہ کہتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی اور قرآن لے آؤ، یا اس میں تبدیلی کردو، آپ فرمادیں: مجھے کیا حق ہے کہ میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کروں؟ میں تو صرف ان احکام کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے، اگر

میں اپنے رب کی نافرمانی کروں، تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے۔ (یونس: ۱۵)

غور کیجئے! کہ وی ایچ پی نے جو مطالبہ کیا ہے، وہ کس قدر مشرکین مکہ کے مطالبہ کے مطابق ہے، زمانہ مختلف ہے، لب ولہجہ میں فرق ہے، زبان وبیان کا اختلاف ہے، لیکن فکر ونظر اور قلب وذہن کے فساد میں کیسی یکسانیت ہے: كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ (البقرۃ: ۱۱۸) اور ظاہر ہے کہ آج بھی امتِ مسلمہ اس کا وہی جواب دے گی، جو اس کے پیغمبر نے دیا تھا، کہ یہ ہماری تصنیف یا ہمارے خیالات نہیں ہیں، بلکہ یہ احکامِ خداوندی ہیں، ہماری مجال نہیں کہ اس میں کوئی تبدیلی کریں، اگر ہم نے اس میں ایک شوشہ کی تبدیلی بھی گوارا کی، تو آخرت کے عذاب سے نجات کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔

اور یہ کچھ مشرکین مکہ ہی پر موقوف نہیں، بلکہ ہر عہد میں گمراہ، خدا بیزار اور حقیقت ناشناس لوگ ایسی نامعقول اور ناشائستہ باتیں کہتے رہے ہیں، اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے قوم بنی اسرائیل کا واقعہ تو واضح طور پر ذکر کیا ہے، کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کی طرف سے توراۃ لے کر آئے، تو یہود (جن کی پوری تاریخ اللہ کے احکام سے سرکشی وسرتابی، انبیاء ورسل کے ساتھ استہزاء وتمسخر، اور ایذا رسانی، نیز ظلم وجور سے عبارت ہے) نے اس کے احکام کو ماننے سے انکار کردیا، ان کا مطالبہ تھا کہ اسے آسان کیا جائے اور اس میں جو سخت احکام آگئے ہیں، انہیں بدل دیا جائے، اللہ تعالیٰ نے ان کی اس سرکشی کو دیکھتے ہوئے ان پر کوہِ طور کو اٹھالیا، اور ارشاد فرمایا کہ ہم نے جو احکام دیئے ہیں، انہیں مضبوطی سے تھامو، اور اسے یاد رکھو، ورنہ اس پہاڑ کے نیچے پیس دئے جاؤ گے ”وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ، خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَافِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ“ (البقرۃ: ۶۳) تب جا کر انہوں نے سرِتسلیم جھکایا، اور احکامِ الٰہی کو قبول کیا۔

انسان جیسے خود فانی ہے، اس کے خیالات وافکار بھی فانی اور ناپائیدار ہیں، جو بدلتے رہتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کائنات کے ذرہ ذرہ سے باخبر اور فطرت کائنات کا خالق

و مالک ہے، اس کے لئے ماضی، حال اور مستقبل برابر ہے، اس کا کوئی حکم عدل کے خلاف اور واقعہ کے مغائر نہیں ہوسکتا، اور نہ اس کا کوئی قانون توازن اور اعتدال سے خالی ہوسکتا ہے، اس لئے اس میں تبدیلی کی بات سوچنا بھی بے وقوفی اور نادانی ہے، قرآن نے اس بات کو بہت واضح طور پر کہا ہے:

آپ کے رب کی بات پوری ہوگئی، سچائی اور عدل کے اعتبار سے، کوئی نہیں جو اس کے احکام کو بدل دے، وہ خوب سننے والا اور جاننے والا ہے، جو لوگ زمین میں ہیں، اگر آپ ان کی اکثریت کی بات ماننے لگیں، تو وہ تو آپ کو اللہ کے راستہ سے ہٹا دیں گے، وہ تو محض گمان کی پیروی کرتے ہیں، اور محض انکل لگاتے ہیں، (الانعام: ۱۱۵، ۱۱۶)

اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کی زبان سے کہلایا کہ کیا اللہ کے سوا میں کسی اور حاکم کو تلاش کرسکتا ہوں؟ جب کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر تفصیلی کتاب اُتاردی ہے "اَفَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِیْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ اِلَیْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا " (الانعام: ۱۱۴) یعنی یہ ایسا ناپاک خواب ہے جو قیامت تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا؟

یہ کہنا کہ قرآن وحدیث میں نفرت کی تعلیم دی گئی ہے، کھلا ہوا بہتان اور اتہام ہے، قرآن انسانوں سے نفرت نہیں بلکہ محبت سکھاتا ہے، قرآن اس بات سے منع کرتا ہے کہ انسانوں کا کوئی طبقہ دوسرے انسانوں کو ذلیل وحقیر سمجھے، قرآن کہتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام پوری انسانیت کے باپ ہیں، اور آدم وحوا ہی سے تمام انسان پیدا ہوئے ہیں، یہ انسانی وحدت کا تصور جہاں مساوات کی بنیاد فراہم کرتا ہے، وہیں ایک خاندان اور ایک کنبہ ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے اُنس ومحبت کا برتاؤ بھی سکھاتا ہے، قرآن نے مسلمان اور غیر مسلم میں فرق کیے بغیر کسی بھی نفسِ انسانی کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا "مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا " (المائدہ: ۳۱) اگر اسلام نے غیر مسلموں سے نفرت کی تعلیم دی ہوتی تو یہ بھی کہا ہوتا کہ مسلمان دوسری قوموں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کریں، لیکن قرآن نے صاف اعلان کیا

کہ مذہب کے معاملہ میں کسی طرح کا جبر واکراہ درست نہیں، ''لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ'' (البقرۃ:۲۵۶)

اسلام تو امن وامان اور صلح وآشتی کا مذہب ہے، اور قرآن وحدیث میں قدم قدم پر اس کی تعلیم دی گئی ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: کہ جو غیر مسلم مصالحانہ رویہ اختیار کریں، اور تمہارے ساتھ صلح وآشتی کی زندگی گذارنا چاہیں، تم بھی ان کے ساتھ صلح کا راستہ اختیار کرو :وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا، وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (الانفعال:۶۱)

قرآن نے مسلمانوں سے برسر پیکار غیر مسلموں سے مقابلہ کی تلقین کرتے ہوئے ان لوگوں کو مستثنیٰ کیا جن سے مسلمانوں کا صلح وامن کا معاہدہ ہو، چنانچہ ارشاد ہے:

ان لوگوں سے قتال نہ کرو جو ایسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں کہ تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہو، یا وہ تمہارے پاس اس حال میں آئیں کہ نہ تم سے لڑنا چاہتے ہوں اور نہ اپنی قوم سے اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کو تم پر مسلط فرمادیتا، پھر وہ تم سے جنگ کرتے، اگر وہ تم سے جنگ کرنے سے گریزاں ہیں، اور تم سے صلح چاہتے ہیں، تو اللہ نے تمہارے لئے ان کے خلاف جنگ کی کوئی گنجائش نہیں رکھی ہے، (النساء:۹۰)

کتنا واضح حکم ہے کہ جو غیر مسلم مسلمانوں سے آمادۂ پیکار نہ ہوں، ان کے حقوق کے غاصب نہ ہوں، اور ان کے ساتھ ظلم وزیادتی کی راہ نہ اختیار کرتے ہوں، ان سے نہ جنگ وجدال کی اجازت ہے، اور نہ نفرت وبیگانگی کی گنجائش، ہاں! جو لوگ مسلمانوں کی جان ومال اور عزت وآبرو کے درپے ہوں، اور مسلمانوں کے خلاف نفرت کی سوداگری کرتے ہوں، ان سے یقیناً جہاد کا حکم دیا گیا ہے، یہ نہ صرف اسلام کی تعلیم ہے، بلکہ دنیا کے تمام مہذب قوانین میں اپنی حفاظت اور مدافعت کے بنیادی حق کو تسلیم کیا گیا ہے۔

گری راج کشور کے بیان کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انہوں نے اپنے بیان میں نہ صرف اسلام کی بلکہ ہندو مذہب کی بھی توہین کی ہے، انہوں نے اپنے طور پر اس بات کا

ذمہ لیا ہے کہ وہ ہندو مذہبی کتابوں میں تبدیلی کے لئے تیار ہیں، اولاً تو کشور صاحب کوئی مذہبی شخصیت نہیں ہیں، اس لئے ان کو اپنے یا دوسروں کے مذاہب کے معاملہ میں اظہار خیال سے احتیاط کرنی چاہئے، مذہب کا تعلق عقیدہ اور جذبات سے ہے، یہ سیاست کا میدان نہیں ہے، جس میں ہر نا کردنی اور ہر ناگفتنی کو جائز کر لیا گیا ہے، دوسرے خود ہندو مذہب کے لئے ان کا بیان کس قدر اہانت آمیز ہے، کہ وہ اپنے آپ کو اس میں ترمیم وتبدیلی کا حق دار سمجھتے ہیں، کاش! ہندو مذہبی رہنما اس حقیقت پر توجہ دیں۔اور اس کا نوٹس لیں۔

مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ایسے ناشائستہ بیان پر بھی اشتعال سے بچیں، اس طرح کی باتیں کہنا ان لوگوں کا مزاج ہوتا ہے جو فکر ونظر اور استدلال کے معرکہ میں شکست خوردہ ہوتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ فریق مخالف کو مشتعل کر کے حقائق کی طرف سے لوگوں کی توجہ ہٹادیں، اگر ہم ایسی باتوں پر بے برداشت ہو جائیں، تو یہ ان ہی کا تعاون اور ان کے مذموم مقاصد کی تکمیل ہوگی اس لئے ہمیں پوری سمجھ داری اور دانش مندی سے کام لینا چاہئے علم واستدلال کی زبان میں ایسی بے معنی باتوں کا جواب دینا چاہئے، اور واضح کر دینا چاہئے کہ نہ ہم اپنے مذہب کے لئے ایسی باتوں کو گوارا کر سکتے ہیں، اور نہ ہم دوسرے مذاہب کے بارے میں ایسا مطالبہ کرتے ہیں، ہم تمام مذاہب کے احترام اور بقاءِ باہم کے اصول پر کاربند ہیں اور رہیں گے۔

(۲/اگست ۲۰۰۲ء)

قرآن مجید اور دہشت گردی

قرآن مجید جس عہد اور جس سماج میں نازل ہوا، اس کا سب سے تکلیف دہ پہلو لاقانونیت، بدامنی اور غارتگری تھی، لاقانونیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ جزیرۃ العرب میں باضابطہ کسی حکومت کا وجود نہیں تھا، عرب کے گرد و پیش جو حکومتیں قائم تھیں، وہ نسل برتری اور کہتری پر یقین رکھتی تھیں اور جو انسانی سماج پیدائشی عظمت اور تحقیر کے تصور پر قائم ہو ظاہر ہے کہ وہاں عدل و انصاف کا قائم ہونا ممکن نہیں ایسے ماحول میں اللہ کی آخری کتاب قرآن مجید کے نزول کا آغاز ہوا، اس کتاب میں جو سب سے پہلی آیت نازل ہوئی اس میں علم اور قلم کی اہمیت کو بتایا گیا اور یہ بھی بتایا گیا کہ تمام انسان کا مادۂ تخلیق ایک ہی ہے، اس میں انسانی وحدت کی طرف اشارہ تھا، علم انسان کو قانون کا پابند بناتا ہے اور انسانی مساوات کے تصور سے عدل کا جذبہ اُبھرتا ہے اور تکریم انسانیت کا عقیدہ پروان چڑھتا ہے، اسی لئے ایک ایسا ملک جو امن و امان سے یکسر محروم تھا اور جہاں ظلم و جور اور دہشت گردی نے قانون کا درجہ حاصل کرلیا تھا، اسلام نے اس کو امن و سلامتی سے ہمکنار کیا، انسانی اُخوت کا سبق پڑھایا، اور رسول اللہ ﷺ کی وہ پیشین گوئی پوری ہوئی کہ ایک خاتون تنہا اونٹنی پر سوار ہو کر صنعاء یمن سے شام تک کا سفر کرے گی۔

اس نے اپنے متبعین کے لئے دو ایسی تعبیرات اختیار کیں جن کے معنی ہی ''امن و امان'' اور ''صلح و سلامتی'' کے ہیں، یعنی ''مومن اور مسلم''، مومن کے معنی امن دینے والے کے ہے اور مسلم کے معنی صلح اور دوسروں کی سلامتی کا لحاظ رکھنے والے کے، اس کتاب کی ابتداء، بسم اللہ الرحمن الرحیم سے ہوئی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی رحمت عامہ، اور آپ ﷺ کے مہربان ہونے کا ذکر ہے اور پہلی سورت کی پہلی آیت میں ہی خدا کو' تمام کائنات کا

رب'' قرار دیا گیا ہے، رب کا لفظ بے پناہ شفقت اور ممتا کو ظاہر کرتا ہے اور تمام عالم کا رب کہہ کر پوری کائنات کو رشتۂ اخوت میں باندھ دیا گیا ہے، اور ایسی آفاقیت کا تصور دیا گیا ہے کہ جس میں پوری انسانیت ایک کنبہ اور ایک خاندان کا درجہ رکھتی ہے، غرض کہ قرآن مجید امن وامان، انسانی اخوت اور آفاقیت کا علمبردار ہے، لیکن بد قسمتی سے سورج پر تھوکنے کی کوشش کی جارہی ہے، اور بعض تنگ نظر حضرات یہ کہنے کی جسارت کررہے ہیں کہ قرآن مجید میں کچھ نقص ہے، جس کی وجہ سے اس کتاب کے پڑھنے والوں میں دہشت گردی کا رجحان پیدا ہوتا ہے، یہ ایسی بہتان تراشی ہے کہ کوئی ایسا شخص جس نے سرسری طور بھی قرآن مجید کا مطالعہ کیا ہوگا وہ ہرگز اس سے متاثر نہیں ہوسکتا، کہ یہ دن کو رات اور برف کو آگ کہنے کے مترادف ہے!

عربی زبان میں دہشت گردی کو ''ارھاب'' کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، قرآن نے مسلمانوں کو یقیناً اس بات کی تعلیم دی ہے کہ ان کے پاس ایسی طاقت موجود رہنی چاہئے کہ ان کے دشمنوں کو ظلم وجور کے ارتکاب کی ہمت نہ ہو، اور وہ مرعوب رہیں، اس کو قرآن نے ''قوت مرہبہ'' سے تعبیر کیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

''وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ''۔ (الانفال:۶۰)

ان کے لئے جس قدر ممکن ہو طاقت اور گھوڑے تیار کرکے رکھو، تاکہ تم اس کے ذریعہ اللہ اور اپنے دشمن اور دوسرے لوگ جنہیں تم نہیں جانتے لیکن اللہ انہیں جانتا ہے، مرعوب رکھ سکو۔

قرآن کے اس بیان سے واضح ہے کہ طاقت دشمنوں کو مرعوب رکھنے اور ان کو ظلم وجور سے باز رکھنے کے لئے ہے، نہ کہ بے قصور لوگوں کو نشانہ بنانے اور تباہی و بربادی پھیلانے کے لئے۔

قرآن کے احکام جہاد سے یہ غلط فہمی پیدا کی جاتی ہے کہ وہ بے قصور، کسی بھی غیر مسلم پر

حملہ کرنے اور اس کو ہلاک کر دینے کی اجازت دیتا ہے، اور اس کے لئے اس آیت کو پیش کیا جاتا ہے، جس میں کفار کو قتل کرنے کا عمومی حکم ہے، یہ محض غلط فہمی ہے، اس آیت کا تعلق مشرکین مکہ سے ہے، وہ مستقل طور پر مسلمانوں سے برسر جنگ تھے، اور مسلمانوں کی طرف سے کی جانے والی صلح کی کوششوں کو قبول کرنے کے لئے قطعاً تیار نہیں تھے، چنانچہ جو لوگ مسلمانوں سے برسر پیکار نہ ہوں، اور جن لوگوں نے ان کو گھر سے بے گھر اور شہر سے شہر بدر نہیں کیا تھا، قرآن ان کے ساتھ حسنِ سلوک اور عدل و احسان کا حکم دیتا ہے، چنانچہ ارشاد ہے :

"لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ" (الممتحنة:۸)

اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں کے ساتھ بہتر سلوک اور انصاف سے نہیں روکتے، جو تم سے دین کے معاملہ میں برسر پیکار نہیں ہیں، اور جنہوں نے تم کو تمہارے گھروں سے نکالا نہیں ہے، بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔

دہشت گردی میں بنیادی طور پر اس بات پر توجہ نہیں دی جاتی کہ اصل ظالم کون ہے؟ بلکہ اس کے متعلقین میں جو بھی ہاتھ آجائے اسے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے، اسلام نے اس کو قطعاً غیر اصولی اور غیر انسانی حرکت قرار دیا ہے، قرآن نے قاعدہ مقرر کر دیا ہے کہ ایک شخص کی غلطی کا بوجھ، اور اس کی ذمہ داری دوسرے پر نہیں ڈالی جاسکتی:

"لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى"

(الفاطر:۱۸)

قرآن نے ایک شخص کے قتل کو پوری انسانیت کے قتل کے مترادف قرار دیا ہے، "مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا"

(المائدہ: ۳۱)

قرآن نے ان اسباب کو بھی روکنے کی کوشش کی ہے جو دہشت گردی کا موجب بنتے

ہیں، زیادہ تر دہشت گردی کا سبب یہ بات ہوتی ہے کہ لوگ دوسروں کو جبراً اپنے مذہب وعقیدہ کا متبع بنانا چاہتے ہیں، عیسائیوں کی مذہبی تاریخ اس کی کھلی ہوئی مثال ہے، قرآن سے صاف اعلان کردیا کہ دین کے معاملہ میں جبرواکراہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے: ''لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ '' (البقرۃ:۲۵۶) اس لئے اس بات سے بھی منع کیا گیا کہ کوئی گروہ دوسروں کے مذہبی مقتدا اور پیشواؤں کو بُرا بھلا کہے، کہ اس سے جذبات مشتعل ہوتے ہیں: ''لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ'' (الانعام:۱۰۷)

کسی معاشرہ میں دہشت گردی کے پنپنے کا اصل سبب ظلم وناانصافی ہے، جو گروہ مظلوم ہوتا ہے، اگر وہ ظالم کا مقابلہ نہیں کرپاتا ہے، اور انصاف کے حصول سے محروم رہتا ہے، تو اس میں منتقمانہ جذبات پرورش پاتے ہیں، اور جب وہ دیکھتا ہے کہ قانونی راستے بند ہیں، تو غیر قانونی راستہ اختیار کرلیتا ہے، اس لئے دہشت گردی کو روکنے کا سب سے مؤثر طریقہ یہ ہے کہ معاشرہ میں ظلم وجور کا دروازہ بند کیا جائے، اور عدل وانصاف کو پوری غیر جانبداری کے ساتھ نافذ کیا جائے، تاکہ دہشت گردی پر ابھارنے والے عوامل باقی نہ رہیں، اسی لئے قرآن نے جگہ جگہ عدل کا حکم دیا ہے، اور اس کی بڑی تاکید کی ہے، ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ عدل وانصاف کا حکم دیتے ہیں: '' اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ '' (النحل:۹۰)۔ قرآن نے تاکید کی ہے کہ کسی قوم سے عداوت بھی تم کو اس کے ساتھ ظلم وناانصافی پر کمربستہ نہ کردے، اور جادہ عدل سے ہٹانے نہ پائے، (المائدہ:۸)

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ عالمِ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نہایت شدت کے ساتھ دہشت گرد ہونے کا پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے، حالانکہ خود مسلمان ملکی اور عالمی دہشت گردی کا نشانہ بنے ہوئے ہیں، جن ملکوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں مسلمانوں کی حالتِ زار ناقابلِ بیان ہے، مسلمان اگر اپنے ملک میں بھی خود اپنی خواہش اور مرضی سے اسلامی نظامِ حیات کو نافذ کرنا چاہتے ہیں تو ان کو تہذیبی تصادم اور شدت پسندی کا نام دے کر مداخلت کی راہ ہموار کی جاتی ہے، اور ان سے وہی کچھ کہا جاتا ہے، جو انبیاء کی اقوام ان سے کہا کرتی تھی، مثلاً حضرت شعیبؑ اور ان کی قوم کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا:

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَا اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا

(الاعراف:۸۸)

حضرت شعیب کی قوم میں سے تکبر پر آمادہ گروہ نے کہا کہ اے شعیب! ہم تجھ کو اور تیرے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنے شہر سے نکال کر ہی رہیں گے، یا تو تم ہمارے دین میں واپس آجاؤ۔

آج ہندوستان میں فرقہ پرستوں کی طرف سے نعرہ لگایا جاتا ہے "کہاں جائے گا مسلمان؟ پاکستان یا قبرستان!" حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نے حضرت شعیب علیہ السلام سے جو کچھ کہا تھا کیا یہ نعرہ اس سے مختلف ہے؟ قریب قریب یہی صورتحال مسلمانوں کے ساتھ دنیا کے مختلف علاقوں میں ہے، اعداء اسلام اور طاغوتی طاقتیں اس وقت تک مطمئن نہیں ہوسکتیں جب تک مسلمان اپنے ایمان وعقیدہ اور تہذیب وثقافت سے دستبردار نہ ہو جائیں، اور ظاہر ہے کہ اصحابِ ایمان کے لئے یہ قطعاً ناقابلِ قبول ہے، قرآن نے یہود ونصاریٰ کی نفسیات اور اسلام کے تئیں ان کے بغض وعداوت اور مزاج ومذاق کا کیا خوب نقشہ کھینچا ہے:

لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ

(البقرۃ:۱۲۰)

یہود ونصاریٰ آپ سے اس وقت تک راضی ہو ہی نہیں سکتے جب تک آپ ان کے دین کے پیرو نہ ہو جائیں۔

آج پوری دنیا میں مسلمانوں کے خلاف اصل ناراضگی اسی کی ہے کہ یہ مغرب کی مادر پدر آزاد ثقافت کے سامنے سرنگوں کیوں نہیں ہوتے؟ یہ اخلاقی اقدار اور شرم وحیاء کے علمبردار کیوں بنے پھرتے ہیں؟ مسلمانوں کا کام یہ ہے کہ وہ ان مشکل حالات میں صبر واستقامت سے کام لیں، اور مغرب ومشرق کی مشترکہ دہشت گردی اور انسانیت سوزی سے خوف زدہ نہ ہوں کہ یہ ایک آندھی ہے جو گذر جائے گی، اللہ تعالیٰ نے حضراتِ صحابہ کی

استقامت کا کیا خوب ذکر فرمایا ہے کہ انہیں جس قدر ڈرایا جاتا اسی قدر ان کے ایمان و یقین میں اضافہ ہوتا جاتا تھا:

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۔ (آل عمران:۱۷۳)

صحابہ سے لوگوں نے کہا کہ (مخالفین نے) بہت سارے لوگ تمہارے مقابلہ میں جمع کر لئے ہیں، تم ان سے ڈرو، تو ان کے ایمان میں مزید اضافہ ہی ہوگیا۔

ایمان کی علامت یہی ہے کہ اللہ کے دین کی سربلندی کی راہ میں جس قدر ابتلائیں اور آزمائشیں آئیں، عداوتوں کے طوفان اٹھیں، مخالفتوں کی لہریں موجزن ہوں خوف و دہشت کا ماحول پیدا کیا جائے، حوصلہ شکن حالات کا سامنا ہو، اسی قدر ان کی ہمتیں بلند ہوتی جائیں، ان کے حوصلے ٹوٹنے نہ پائیں، اور مخلوق کا خوف ان پر غالب نہ ہونے پائے، اس وقت پوری دنیا میں مسلمانوں کے تئیں دہشت گردی کا جو پروپگنڈہ ہو رہا ہے، یہاں تک کہ قرآن جیسی عظیم کتاب کو بھی نشانۂ تنقید بنایا جا رہا ہے، اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ مسلمان ہمت ہار جائیں، وہ مغرب کی ریشہ دوانیوں کی سامنے سرنگوں ہو جائیں، اور اسلام کے بارے میں احساسِ کمتری میں مبتلا ہو کر رہ جائیں، پس ان حالات میں مسلمانوں کو اپنا حوصلہ بلند رکھنا اور صبر و استقامت کی راہ اختیار کرنا ضروری ہے۔

(۲۸ ردسمبر ۲۰۰۱ء)

۲۴ آیتیں

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، یہ انسانیت کے لیے ابدی پیغام اور زندہ دستور العمل ہے، یہ بیک وقت دماغ کو بھی مطمئن کرتی ہے اور بربط دل کو بھی چھیڑتی ہے۔ یہ ایک انقلاب انگیز کتاب ہے، جیسے سورج کی تمازت میں کبھی کمی نہیں آسکتی اور سمندر کی وسعتوں کو کم نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح اس کتاب کی اثر انگیزی، اس کی تاثیر، دلوں کو زیر و زبر کر دینے کی صلاحیت اور فکر و نظر پر چھا جانے کی طاقت میں کبھی کوئی کمی نہیں ہو سکتی، یہ رَواں دَواں زندگی میں انسان کی رہنمائی کی پوری صلاحیت رکھتی ہے، اس لیے اس کی آب و تاب میں کوئی فرق نہیں آسکتا، خود اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے، جو اس بات کا اعلان ہے کہ قرآن مجید قیامت تک اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ محفوظ رہے گا۔

دنیا میں جو دوسری مذہبی کتابیں ہیں، انسانی زندگی سے ان کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے، آج کوئی ہندو، بدھسٹ یا عیسائی اپنی تجارت، کاروبار، نظامِ حکومت، طریقۂ عدل و انصاف، ازدواجی زندگی، خاندانی تعلقات، مختلف قوموں کے باہمی روابط اور اس طرح کے دوسرے مسائل میں اپنی مذہبی کتابوں سے رجوع نہیں کرتا، نہ اپنے مذہبی علماء سے احکام و مسائل معلوم کرتے ہیں، زیادہ سے زیادہ بعض قومیں نحس و برکت وغیرہ کے سلسلہ میں جو توہمات ہیں، ان کے لیے مذہبی شخصیتوں سے رجوع ہوتے ہیں اور کچھ عبادتی رسوم کو اپنی عبادت گاہوں میں انجام دے لیتے ہیں، عام لوگ ان کتابوں کو نہ پڑھتے ہیں، نہ سمجھتے ہیں، سمجھا جاتا ہے کہ کچھ مخصوص لوگ ہی اس کو پڑھنے اور سمجھنے کے اہل ہیں، اس لیے ان قوموں کی زندگی میں مذہب کا ہمہ گیر تصور نہیں پایا جاتا اور وہ زندگی کے عام مسائل میں اپنی خواہش کے متبع ہیں، نہ کوئی حلال ہے نہ حرام، نہ جائز نہ ناجائز اور نہ مکروہ نہ مستحب۔

لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ امت مسلمہ اپنی بہت سی کمزوریوں اور کوتاہ عملیوں کے باوجود آج بھی اپنے مذہب سے مربوط ہے، خود ہمارے ملک ہندوستان میں بیسیوں دارالافتاء ہیں، جن کے پاس روزانہ سینکڑوں کی تعداد میں فتاویٰ کی ڈاک آتی ہے اور لوگ زندگی کے نوع بنوع مسائل کے بارے میں حکم شرعی دریافت کرتے ہیں، کسی جبر و دباؤ کے بغیر اپنے سینکڑوں نزاعات کو شرعی پنچایت اور دارالقضاء ہی میں لے جاتے ہیں اور مسلمان چاہے زندگی کے کسی بھی شعبہ میں ہو، اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی زندگی گذارے، اسی چیز نے اسے الحاد و بددینی کے اس طوفان میں بھی دین سے مربوط رکھا ہے اور وہ اس لادینی ثقافت کے آگے سر تسلیم خم کرنے کو تیار نہیں ہیں، جس کے سامنے آج تمام قومیں اپنی شکست تسلیم کر چکی ہیں، یہ سب قرآن مجید کا فیض ہے، یہ وہ چیز ہے جس نے حق اور سچائی کے دشمنوں کو قرآن مجید کے خلاف کھڑا کر دیا ہے، لیکن یہ بات کہ قرآن مجید کا کچھ حصہ حذف کر دیا جائے، کوئی نئی بات نہیں ہے، یہ مطالبہ تو خود نزول قرآن کے زمانہ میں بھی رہا، لیکن جیسے ان معاندین کی خواہش ناکام و نامراد ہوئی، آج جو لوگ قرآن مجید کے خلاف زبان کھول کر سورج پر تھوکنے کی کوشش کر رہے ہیں، ان کی اس بے جا خواہش اور مطالبہ کا بھی وہی حشر ہوگا۔

ہندوستان میں حقیقت پسند ہندو علماء نے ہمیشہ قرآن مجید کو عقیدت و احترام کی نظر سے دیکھا ہے۔ گاندھی جی اور ونوبا بھاوے مذہبی شخصیت کے حامل تھے۔ گاندھی جی قرآن مجید سے بہت متاثر تھے اور اس کی تلاوت بھی کیا کرتے تھے، یہی حال ونوبا جی کا تھا، انہوں نے تو قرآن کی منتخب آیات کا ترجمہ اور مختصر تشریح بھی ''روح القرآن'' کے نام سے مرتب کی ہے، ہندوستان میں طباعت و اشاعت کی موجودہ سہولتوں اور پریس کی کثرت کے دور سے پہلے قرآن مجید کی طباعت میں سب سے نمایاں کام 'منشی نولکشور لکھنؤ' کا ہے، وہ صحت کے مکمل اہتمام کے ساتھ قرآن مجید طبع کیا کرتے تھے اور طباعت کے لیے سنگی تختیاں تیار کرتے تھے، نیز انہیں احتراماً دوسری زیر طباعت کتابوں اور ان کی تختیوں سے اوپر رکھا کرتے تھے، یہ ان ہندو بزرگوں کا حال تھا، جنہوں نے قرآن مجید کو پڑھا تھا اور براہِ راست اس عظیم کتاب کے مطالعہ کی سعادت حاصل کر چکے تھے۔

قرآن مجید کے بارے میں ہندو علماء کے تأثرات

قرآن مجید کے بارے میں بابا بھوپندر ناتھ باسو فرماتے ہیں:

تیرہ سو برس کے بعد بھی قرآن کی تعلیم کا یہ اثر موجود ہے کہ ایک خاک روب بھی مسلمان ہونے کے بعد بڑے بڑے خاندانی مسلمانوں کی برابری کا دعویٰ کر سکتا ہے۔

بابو بپن چندر پال کہتے ہیں:

قرآن کی تعلیم میں ہندوؤں کی طرح ذات، پات کا امتیاز موجود نہیں ہے، نہ کسی کو محض خاندانی اور مالی عظمت کی بنا پر بڑا سمجھا جاتا ہے۔

مشہور قائد مسز سروجنی نائیڈو کا یہ بیان کس قدر حقیقت پسندانہ ہے کہ:

قرآن کریم غیر مسلموں سے بے تعصبی اور رواداری سکھاتا ہے، دنیا اس کی پیروی سے خوش حال ہو سکتی ہے۔

بابائے قوم مہاتما گاندھی جی کا ارشاد ہے:

مجھے قرآن کو الہامی کتاب تسلیم کرنے میں ذرہ برابر بھی تأمل نہیں ہے۔

(سہ روزہ دعوت: ۱۳ر مئی ۱۹۸۸ء ص ۷۶)

قرآن مجید کے ہندو مترجمین وناشرین

قرآن مجید سے اسی تعلق اور عقیدت کا اثر ہے کہ مختلف ہندو اہل علم نے قرآن مجید کا ہندی زبان میں ترجمہ کیا ہے، یا قرآن کی منتخب آیات کو اپنی زبان میں منتقل کیا ہے، ونوبا بھاوے کی ''روح القرآن'' کا ذکر اوپر آچکا ہے، ہندی کے مشہور شاعر بھارتیندو ہرش چندر نے بھی قرآن کا ترجمہ شروع کیا تھا، جو رسالہ ہرش چندر میں ۱۸۷۷ء میں شائع ہونا شروع ہوا تھا، لکھنؤ کے نند کمار اودستھی نے بھی قرآن پاک کا اردو میں ترجمہ کیا ہے، آریہ سماجیوں کی طرف سے بھی وید کے منتروں سے تقابل کرتے ہوئے قرآنی آیات کا انتخاب مع ترجمہ شائع کیا گیا ہے، ۱۹۹۴ء میں ہندوستان کے سابق کیبنٹ سکریٹری ونود چند پانڈے نے بھی قرآن کا ترجمہ کیا ہے، انہیں اعتراف ہے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے بلکہ وحی ہے، سردار جگجوت سنگھ کی فرمائش پر کنہیا لال لکھداری نے بھی قرآن کا ترجمہ کیا، جو چار

سو پندرہ صفحات پر دھرم سبھا لدھیانہ سے ۱۸۸۲ء میں شائع ہوا تھا، اس ترجمہ میں شاہ عبد القادر صاحب کے ترجمہ سے مدد لی گئی ہے۔

بنگال کے ایک ہندو عالم گریش چندر سنگھ نے ۱۸۸۱ء میں قرآن مجید کا بنگالی زبان میں ترجمہ کیا، ۱۹۲۶ء میں بنگلہ بولنے والے مسلم علماء نے اس ترجمہ کو مستند قرار دیا۔ پنڈت کیلاش چندر برہست نے جناب امام الدین رام نگری کے ساتھ مل کر مولانا صدر الدین اصلاحی مرحوم کے ترجمہ کو ہندی میں منتقل کیا، یہ ترجمہ ۱۹۵۵ء میں رامپور سے شائع ہوا اور اس کے صرف دو ہی پارے منظر عام پر آسکے، جناب پران ناتھ نے اپنی گجراتی تالیف ''قلزم سروپ'' میں قرآن اور وید کے متن کا انتخاب پیش کیا ہے، دھن پرکاش ایڈوکیٹ سپریم کورٹ دہلی نے قرآن مجید کا منظوم ہندی ترجمہ ''پوتر قرآن درشن'' کے نام سے کیا ہے، جسے ''الوک پرکاش'' نے شائع کیا ہے اور فروری ۲۰۰۰ء کے کتابی میلہ میں اسے نمائش وفروخت کے لئے بھی رکھا گیا تھا، شیخ محمد یوسف کا ہندی ترجمہ قرآن جس شخصیت نے شائع کیا، وہ ہیں پنڈت دولت رام شرما، یہ ترجمہ اسٹار پریس بازار ہال امرتسر سے اشاعت پذیر ہوا تھا۔

(ملخص از دراسات اسلامیہ کے فروغ میں ہندوؤں کا حصہ: ص ۱۵۸۔۱۵۵)

یہ ان ہندو بزرگوں کا حال تھا، جنہوں نے قرآن مجید کو پڑھا تھا اور براہِ راست اس عظیم کتاب کے مطالعہ کی سعادت حاصل کر چکے تھے۔

اب یہ بے چارے وی، ایچ، پی والے جو سیاست کے لیے مذہب اور دھرم کا ناجائز استعمال کرتے رہے ہیں اور اپنی زہر آلود تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ انسانوں کو بانٹنے اور دلوں کو تقسیم کرنے کا کام کر رہے ہیں، ان ہی لوگوں نے سیدھے سادھے، سادہ لوح ہندو بھائیوں کے دلوں میں نفرت کی بیج بونے اور مسلمانوں کے خلاف تشدد پیدا کرنے کی غرض سے قرآن مجید کی ۲۴ آیتوں کا انتخاب کیا ہے اور ان کے ذریعہ یہ بتانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ قرآن کریم غیر مسلموں کو قتل کرنے، ان کا دشمن ہونے اور انہیں دوست نہ بنانے کی تعلیم دیتا ہے، اس لیے مسلمان کبھی بھی غیر مسلموں کے حق میں مہربان اور رحم دل نہیں ہو سکتے۔

اس پروپگنڈے کی حقیقت یہ ہے کہ انہیں آگے پیچھے کے مضمون سے کاٹ کر یا جن غیر مسلموں سے عہد نبوت کے مسلمانوں کا سابقہ تھا، ان کو نظر انداز کر کے اور ان آیات کو ان کے نازل ہونے کے پس منظر کو بیان کیے بغیر پیش کیا جا رہا ہے، ظاہر ہے کہ کسی بھی بات کو اگر اس کے پس منظر سے ہٹا دیا جائے، یا اس کو آگے یا پیچھے کی عبارتوں سے کاٹ کر پیش کیا جائے، تو اچھی سے اچھی بات کا بھی غلط مفہوم نکالا جا سکتا ہے۔ اسی پس منظر میں ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ان آیات کے بارے میں صحیح صورتِ حال پیش کر دی جائے۔

بحیثیتِ مجموعی یہ آیات تین طرح کی ہیں: دس آیات جہاد سے متعلق ہیں، چھ آیات غیر مسلموں سے تعلق و دوستی رکھنے نہ رکھنے اور ان کے دوستی کے لائق ہونے اور نہ ہونے سے متعلق ہیں اور آٹھ آیتیں غیر مسلموں پر عذاب سے متعلق ہیں۔ جن آیات کو زیادہ تر پروپیگنڈہ کا ذریعہ بنایا گیا ہے، وہ جہاد سے متعلق آیتیں ہیں، اس لیے پہلے ان ہی آیات پر گفتگو کی جاتی ہے:

جہاد سے متعلق آیات

وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَاءً فَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ أَوْلِيَاءَ حَتَّى يُهَاجِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا

(النساء:۸۹)

وہ چاہتے ہیں کہ جیسے یہ لوگ کفر کر رہے ہیں تم بھی کفر کرو، تاکہ تم ایک جیسے ہو جاؤ، تو تم ان میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ، جب تک وہ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کر جائیں، اگر وہ اس کی خلاف ورزی کریں، تو انہیں جہاں کہیں پاؤ، پکڑو اور قتل کرو اور ان میں سے کسی کو دوست اور مددگار نہ بناؤ۔

اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ اس وقت اہل مکہ نے مسلمانوں کو بے حد اذیت پہنچائی تھی، یہاں تک کہ ان کے قتل کے درپے ہو گئے تو مسلمانوں کو مجبور ہو کر ترکِ وطن

کرنا پڑا اور انہوں نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی، پھر یہاں بھی مسلمانوں کا چین وسکون انہیں پسند نہیں آیا اور انہوں نے بار بار مدینہ پر اپنی یلغار جاری رکھی، ظاہر ہے جولوگ مسلمانوں کی جان کے درپے ہیں، تو اپنی مدافعت کے طور پر وہاں مسلمانوں کو بھی اس بات کا پورا حق حاصل تھا، کہ وہ ان کی زیادتیوں کا جواب دیں، اس آیت سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ مسلمانوں سے تبدیلیٔ مذہب اور ارتداد سے کم کسی اور بات پر رضامند نہیں تھے، جو ظاہر ہے کہ کھلا ہوا ظلم ہے۔

پھر اس سے اگلی آیات کو دیکھا جائے تو بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> إِلَّا الَّذِينَ يَصِلُونَ إِلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ أَوْ جَاءُوكُمْ حَصِرَتْ صُدُورُهُمْ أَن يُقَاتِلُوكُمْ أَوْ يُقَاتِلُوا قَوْمَهُمْ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقَاتَلُوكُمْ فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا (نساء: ۹۰)
>
> سوائے ایسے لوگوں کے جو ان سے جا ملیں، جن کے اور تمہارے درمیان عہد (معاہدۂ امن) ہو، یا وہ تمہارے پاس اس طرح آئیں کہ نہ تم سے لڑنا چاہتے ہوں نہ اپنی قوم سے، حالانکہ اگر اللہ چاہتے تو ان کو تم پر مسلط کردیتے، پھر وہ تم لوگوں سے جنگ کرتے، تو اگر وہ تم سے کنارہ کش رہیں جنگ نہ کریں اور صلح پیش کریں، تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ان کے خلاف کوئی راستہ نہیں رکھا ہے۔

دیکھئے! اس آیت نے اس بات کو واضح کردیا کہ اس سے پہلی آیت میں قتال کا حکم ان لوگوں سے ہے جو مسلمانوں سے برسرِ جنگ ہوں، جو غیر مسلم مسلمانوں کے حلیف ہوں، یا مسلمانوں کے حلیف کسی غیر مسلم گروہ کے حلیف ہوں، یا غیر جانبدار ہوں، نہ مسلمانوں سے جنگ چاہتے ہوں اور نہ ان لوگوں سے جو مسلمانوں سے جنگ کی حالت

میں ہوں، تو ان تینوں طرح کے لوگوں سے مسلمانوں کے لیے قتال درست نہیں، بلکہ قرآن نے صاف طریقہ پر مسلمانوں کو حکم دیا کہ جو غیر مسلم مسلمانوں کے ساتھ صلح وامن کا راستہ اختیار کریں، مسلمانوں کو ضرور ہی ان کے اس رویہ کا جواب صلح اور امن سے دینا چاہیے اور کوئی زیادتی نہیں کرنی چاہیے۔

دوسری آیت

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ . (انفال : ٦٥)

اے نبی! ایمان والوں کو قتال پر آمادہ کیجئے، اگر تم میں سے بیس آدمی بھی ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر غالب آجائیں گے اور اگر سو آدمی ایسے ہوں تو ایک ہزار منکرین پر بھاری رہیں گے؛ کیوں کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے۔

یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر غزوۂ بدر کے بعد نازل ہوئی، بلکہ یہ پوری سورت ہی زیادہ تر غزوۂ بدر کے واقعات اور اس واقعہ سے متعلق شرعی احکام پر مشتمل ہے۔ غزوۂ بدر ان حالات میں ہوئی کہ مسلمان ظلماً مکہ سے نکال دیے گئے تھے، بہت سے ہجرت کرنے والے مسلمانوں کے قریب ترین اعزہ کو جبراً مکہ میں روک لیا گیا تھا، اہل مکہ کے مقابلہ مسلمان تعداد میں کم تھے، اسلحہ اور دوسرے وسائل کے اعتبار سے بھی مکہ کے حملہ آوروں کا پلڑہ بھاری تھا، اس پس منظر میں مسلمانوں سے کہا گیا کہ وہ اپنی تعداد کی کمی پر نظر نہ رکھیں، بلکہ اپنے مقصد پر نگاہ رکھیں، کہ مکہ کے لوگ تو بن سمجھے بوجھے محض اکسانے پر حملہ آور ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کا مقابلہ کرنا ایک خاص مشن کے تحت ہے، اس لیے اگر تم کم بھی ہو تو زیادہ لوگوں پر غالب آسکتے ہو۔ اب غور کیجئے، کہ اس میں کن غیر مسلموں سے مقابلہ کے لیے مسلمانوں کو ترغیب دی گئی ہے، ان غیر مسلموں کے خلاف جو نہ تھمنے والے تلاطم کی طرح آگے بڑھ بڑھ کر مسلمانوں پر حملہ کر رہے تھے اور ان کے جان و مال

کے درپے تھے، اگر مسلمانوں کی طرف سے پہل ہوتی، تو یہ جنگ بدر کے بجائے (جو مدینہ کے قریب واقع ہے) مکہ کے قریب ہوئی ہوتی، تو کیا حملہ آوروں کے لیے مقابلہ پر ابھارنا کوئی ناواجبی بات ہے؟ اگر ہمارے ملک پر دشمن حملہ آور ہوں تو کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہوگا کہ ہم اہل وطن کو ان سے مقابلہ کی ترغیب دیں غور کیجئے کہ ظلم کرنا مذموم ہے یا ظلم کا جواب دینا۔ یہ ایسی بات ہے جسے معمولی عقل وفہم کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے۔

تیسری آیت

فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ، إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ. (التوبہ:۵)

جب حرمت والے مہینے گذر جائیں، تو تم ان مشرکوں کو جہاں کہیں پاؤ، قتل کرو، انہیں پکڑو، گھیرو، اور ہر گھات کی جگہ ان کی تاک میں بیٹھو، پھر اگر یہ توبہ کرلیں، نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں، تو ان کا راستہ چھوڑ دو، بیشک اللہ معاف کرنے والے مہربان ہیں۔

اس آیت کے مضمون ہی سے ظاہر ہے کہ یہ ان اہل مکہ کے بارے میں ہے جو حرام مہینوں کا احترام کرتے تھے، جو بہت سے مسلمانوں کے قاتل تھے، بہت سے مہاجرین کے رشتہ داروں کو انہوں نے روک رکھا تھا، جہاں کہیں کوئی مسلمان ان کے ہاتھ آجاتا تھا، اسے گرفتار کرلیتے تھے اور اسے قتل کرکے یا قاتلوں کے ہاتھ بیچ کر ہی دَم لیتے تھے، اس سلسلہ میں حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کا واقعہ بہت مشہور ہے، جنہیں گرفتار کرکے اہل مکہ کے ہاتھوں فروخت کیا گیا اور انہوں نے غزوۂ بدر میں ہلاک ہونے والے اپنے مورث کے بدلہ نہایت بے دردی اور سفاکی کے ساتھ انہیں شہید کردیا، انہیں مشرکین کے بارے میں فرمایا گیا کہ تم بھی ان سے ان کے مظالم کا بدلہ لے سکتے ہو۔

اس آیت سے پہلے اور اس کے بعد جو آیتیں آرہی ہیں، اگر انہیں پڑھ لیا جائے تو

صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مشرکین کا ایک خاص گروہ مراد ہے نہ کہ تمام مشرکین، چنانچہ آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے:

أَلَا تُقَاتِلُونَ قَوْماً نَّكَثُواْ أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّواْ بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُم بَدَؤُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ أَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللّهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَوْهُ إِن كُنتُم مُّؤُمِنِينَ. (التوبہ:۱۳)

کیا تم ایسے لوگوں سے قتال نہیں کرو گے جنہوں نے اپنے عہد توڑ دیے، رسول کو جلاوطن کرنے کی ٹھان لی اور انہوں نے تمہارے مقابلہ میں خود ہی پہل کی ہے؟ کیا تم لوگ ان سے ڈرتے ہو؟ اللہ تعالیٰ زیادہ اس لائق ہیں کہ تم ان سے ڈرو اگر تم ایمان لانے والے ہو۔

اس آیت نے بات صاف کر دی کہ پہلے جن مشرکین سے قتال کا حکم دیا گیا ہے، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ عہد شکنی کی، مسلمانوں کو وطن سے بے وطن کرنے پر کمر بستہ رہے اور نقصان پہنچانے اور حملہ کرنے میں پہل کی، چنانچہ علامہ آلوسیؒ نے اوپر (آیت نمبر:۵) میں جن مشرکین کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا، ان کے بارے میں یہی لکھا ہے کہ اس سے یہی عہد شکنی کرنے والے مشرکین مراد ہیں۔ المراد من المشركين الناكثون۔ (روح المعانی:۶/۷۳) ___ پھر سورہ توبہ کی اس دوسری آیت (آیت نمبر:۱۳) نے اس بات کو واضح کر دیا کہ قرآن نے بطور جواب اور مدافعت کے مشرکین سے قتال کی بات کہی ہے؛ کیوں کہ پہل ان ہی کی طرف سے تھی، یہ آیت اور آگے آنے والی آیت بھی دراصل فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی ہے، مشرکین مکہ نے ان آیات کے نازل ہونے سے پہلے اوّلاً تو مسلمانوں کو ان کے وطن 'مکہ' سے نکالا، پھر تین جنگیں ان پر مسلط کیں، ہجرت کے پہلے سال غزوۂ بدر، دوسرے سال غزوۂ احد اور پانچویں سال غزوۂ خندق کا مقصد ہی یہ تھا کہ مسلمانوں کو مدینہ سے بھی اجاڑ دیا جائے، پھر ہجرت کے چھٹے سال اہل مکہ ہی کی شرائط پر صلح حدیبیہ ہوئی اور ایک ڈیڑھ سال کے اندر انہوں نے اس صلح کی بھی دھجی اڑا دی ___ اب بتائیے کہ ایسے لوگوں کے خلاف اگر مزاحمت کی دعوت نہ دی جائے تو کیا ان

کے راستہ میں پھولوں کی سیج بچھانے کو کہا جائے گا؟

چوتھی آیت

قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ. (التوبہ:۱۴)

''ان سے قتال کرو، اللہ تعالیٰ انہیں تمہارے ہاتھوں سے سزا دے گا، رسوا کرے گا، تمہاری ان کے مقابلہ میں مدد کرے گا اور مسلمانوں کے دلوں کو ٹھنڈا کرے گا۔''

یہ سورۂ توبہ کی ۱۴ویں آیت ہے کہ جس سے پہلے ان مشرکین کا ذکر آیا ہے، جنہوں نے عہد شکنی کی تھی اور مسلمانوں پر حملہ کرنے میں پہل کے مرتکب ہوئے تھے، انہیں کے بارے میں یہ بات کہی جارہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو تمہارے ہاتھوں سے سزا دے گا اور تمہاری مدد کرے گا اور اہل مکہ کی زیادتی کی وجہ سے تمہیں جو دکھ پہنچا ہے ___ اور ظلم پر آدمی کا آزردہ خاطر ہونا ایک فطری چیز ہے ___ تو اللہ تعالیٰ اس کے مقابلہ میں تمہارے لیے تسکین خاطر کا سامان کرے گا، ظاہر ہے کہ اس آیت میں ظالموں سے بدلہ لینے کا ذکر ہے، جو عین مطابق انصاف ہے۔

مشہور مفسر امام مجاہدؒ نے نقل کیا ہے کہ اس آیت کا تعلق بنو بکر اور بنو خزاعہ کی لڑائی سے ہے، یہ دونوں ہی قبیلے مشرک تھے، لیکن فرق یہ تھا کہ بنو بکر اہل مکہ کے حلیف تھے اور بنو خزاعہ مسلمانوں کے حلیف تھے، جب حدیبیہ میں مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان تا جنگ معاہدہ ہوا، تو اس معاہدہ میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ اہل مکہ اور مسلمانوں کے حلیف قبائل پر بھی اس کا اطلاق ہوگا اور وہ ایک دوسرے کے خلاف کوئی زیادتی نہیں کریں گے، لیکن ہوا یوں کہ بنو بکر نے بنو خزاعہ پر حملہ کر دیا، یہاں تک کہ حرمِ مکہ جہاں اسلام سے پہلے بھی لوگ اپنے جانی دشمنوں اور اعزہ واقرباء کے قاتلوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے، بنو خزاعہ کے لوگوں کو بے دردی سے قتل کیا گیا اور اس عہد شکنی میں اہل مکہ بھی پوری طرح شریک و سہیم رہے، اسی سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی، جس کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کے

ذریعہ تم ان بدعہدی کرنے والوں پر غالب ہو گے اور ان کے ظلم وزیادتی کی وجہ سے فطری طور پر جو آتش انتقام تمہارے سینہ میں بھڑک رہی ہے، اللہ اسے بجھائیں گے اور تمہارے دلوں کو ٹھنڈا کریں گے۔ (دیکھئے تفسیر قرطبی: ۸/ ۸۶،۸۷)

اب غور کیجئے کہ جن لوگوں نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہو اور خود ہی حملہ کرنے میں پہل بھی کی ہو، کیا ان کے خلاف جوابی کارروائی کرنا ناانصافی کی بات ہے اور کیا قرآن کو یہ کہنا چاہیے تھا کہ تم اپنا اور اپنے حلیفوں کا قتل عام دیکھتے رہو، مگر ہاتھ پر ہاتھ دیے بیٹھے رہو، اپنی طرف سے کوئی جواب نہ دو؟؟

پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن نے جو ظالموں کے مقابلہ خدا کی طرف سے مظلوموں کی مدد بات کہی ہے، یہ کوئی عجوبہ نہیں، بلکہ ہر مذہب میں حق اور سچائی پر قائم رہنے والوں کو اہل باطل اور ظالموں کے مقابلہ خداوندی فتح ونصرت کی خوشخبری سنائی گئی ہے، مثلاً رگوید میں خدا سے اس طرح دعائیں کی جاتی ہیں:

☆ اے روشن آگ! تو جس پر متبرک تیل ڈالا جاتا ہے، ہمارے دشمنوں کو جلادے، جن کی حفاظت خبیث روحیں کرتی ہیں۔ (۱/۱۲:۵)

☆ تو آریوں اور وسیوں کے درمیان امتیاز کر جو اُدھرمی ہیں، ان کو سزا دے اور انہیں اس کے حوالہ کردے جس کی گھاس (دیوتاؤں کے نذرانہ کے لیے) کی رکھی ہے۔" (۱:۵۱:۸)

☆ پس اے اندر! ہم کو بڑھنے والی شوکت عطا کر، ہم کو وہ قہر اور طاقت عطا کر جو قوموں کو مغلوب کرے، ہمارے دولت مند سردھروں کو برقرار رکھ، ہمارے راجاؤں کی حفاظت کر، ہم کو دولت اور خوراک شریف اولاد کے ساتھ عنایت کر۔" (۱/۵۴:۱۱)

بائبل نے مشرکین کی نسبت سے جو لب ولہجہ اختیار کیا ہے، اسے ان اقتباسات میں دیکھا جاسکتا ہے:

"بنی اسرائیل کو خطاب کر اور انہیں کہہ، جب تم یردن سے پار ہو کر زمین کنعان میں داخل ہو تو تم ان سب کو جو اس زمین کے باشندے ہیں، اپنے

سامنے سے بھگاؤ، ان کی مورتیں فنا کردو اور ان کے ڈھالے ہوئے بتوں کو توڑ دو اور ان کے سب اونچے مکانوں کو ڈھادو اور ان کو جو اس زمین کے بسنے والے ہیں خارج کردو اور وہاں آبسو، کیوں کہ میں نے وہ سرزمین تم کو دی ہے کہ اس کے مالک بنو۔ (۳۳:۵۰-۵۴)

اور جب کہ خداوند تیرا خدا انہیں تیرے حوالہ کردے تو انہیں ماریو اور حرم کیجو، نہ تو کوئی ان سے عہد کیجو، اور نہ ان پر رحم کریو، تم ان کے مذبحوں کو ڈھادو اور ان کے بتوں کو ڈھادو، ان گھنے باغوں کو کاٹ ڈالو اور ان کی تراشی ہوئی مورتیں آگ میں جلادو۔ (۷:۲-۵)

غرض کہ ظالموں کے مقابلہ مظلوموں کے ساتھ اللہ کی مدد ہونا اور ظلم کو روکنے کے لیے ظالموں کا پنجہ تھامنا ایک ایسی بات ہے، جو تمام مذاہب کی مشترکہ تعلیم ہے؛ کیوں کہ اگر خدا بھی ظالموں ہی کا طرفدار ہو تو پھر کون سا ایوانِ انصاف ہوگا جہاں ظالموں کو ان کے ظلم کی سزا ملے گی اور مظلوموں کی تسکین خاطر کا سامان ہوگا؟

پانچویں آیت

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ. (التوبہ:۱۲۳)

اے ایمان والو! تمہارے آس پاس جو کفار ہیں، ان سے جنگ کرو اور وہ تمہارے اندر سختی (مضبوطی) پائیں۔

اس آیت میں مسلمانوں کو ان کافروں سے جنگ کے لیے کہا گیا ہے جو ان کے قرب و جوار میں تھے، یعنی اہل مکہ اور ان کے حلیف؛ کیوں کہ یہی مدینہ کے قریب کافروں کی آبادیاں تھیں اور اہل مکہ کا مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک تھا وہ ظاہر ہے، اگر مطلقاً کافروں کے مارنے کا حکم ہوتا تو قریب و دور کے لوگوں میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا، مدینہ، یمن اور شام کے درمیان رہگزر کا درجہ رکھتا تھا اور مختلف غیر مسلم قافلے مدینہ کے قرب و جوار سے گذرتے رہتے تھے، اگر یہ حکم مطلقاً ان سے متعلق ہوتا تو دور کے غیر مسلموں پر بھی حملہ کرنے کو کہا جاتا،

لیکن یہاں قرآن نے ایسا حکم نہ دیا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس آیت کا منشأ ان مشرکین سے جنگ کرنا تھا جو بار بار مسلمانوں پر یلغار کرتے رہتے تھے، نہ رشتہ کا پاس ولحاظ کرتے تھے، نہ صلح اور معاہدہ کا لحاظ، چنانچہ ابن زیدؒ نے یہی کہا ہے کہ اس سے مراد مشرکین عرب تھے، **المراد بهذه الآية وقت نزولها العرب** ۔ (تفسیر قرطبی: ۸/ ۲۹۷)

پھر اس آیت میں جو ''غلظہ'' کا لفظ آیا ہے، اس کے معنی سختی کے بھی آتے ہیں اور طاقت ومضبوطی کے بھی، یہاں اصل میں یہی طاقت ومضبوطی کا معنی مراد ہے، **ای شدة وقوة وحمية** ۔ (حوالہ سابق: ۲۸۹) پس مقصد یہ ہے کہ جو مشرکین تم سے برسر جنگ ہیں وہ تم کو طاقتور محسوس کریں، مرعوب رہیں اور تم کو روند جانے کی جرأت نہ کریں، ظاہر ہے کہ کسی بھی قوم کو یقیناً دوسروں پر تو ظلم نہیں کرنا چاہیے، لیکن اپنے آپ کو ایسا طاقتور ضرور رکھنا چاہیے کہ دوسرے اس کو لقمہ تر نہ سمجھ لیں۔ یہ بالکل معقول اور قرینہ انصاف ہے، مثلاً ہم ہندوستان کے رہنے والے اپنے دیش کے بارے میں جذبہ رکھتے ہیں کہ ہم دوسروں پر زیادتی تو نہیں کریں گے، لیکن ہم اپنے آپ کو یقیناً ایسا خود مکتفی بنا کر رکھیں گے کہ کسی کو ہم پر بری نگاہ ڈالنے کی ہمت نہ ہو، اگر ہم ایسا کہیں تو کیا یہ کوئی غلط بات ہوگی؟

چھٹی آیت

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ وَعْداً عَلَيْهِ حَقّاً فِي التَّوْرَاةِ وَالإِنجِيلِ وَالْقُرْآنِ وَمَنْ أَوْفَى بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ فَاسْتَبْشِرُواْ بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُم بِهِ وَذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (التوبہ: ۱۱۱)

بے شک اللہ نے مؤمنوں سے ان کی جان ومال اس کے بدلہ خرید لیا ہے کہ ان کے لیے جنت ہے، وہ اللہ کے راستہ میں جنگ کرتے ہیں، تو قتل کرتے بھی ہیں اور قتل کیے بھی جاتے ہیں۔ اسی پر سچا وعدہ ہے تو ریت اور انجیل اور قرآن میں، اور اللہ سے بڑھ کر کون اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہے؟ سو تم خوشی مناؤ اپنی معاملت پر جو تم نے کی ہے اور یہی تو بڑی کامیابی ہے۔

اس آیت میں یہی بات تو کہی گئی ہے کہ جو مسلمان ظالموں کے خلاف سر ہتھیلی پر لے کر نکل آئیں اور اس راہ میں اپنی جان و مال کی بھی فکر نہ کریں، ان کو اللہ جنت سے نوازیں گے۔

قرآن کے اس ارشاد میں کون سی بات خلاف انصاف ہے؟ کیا ہم یہ نہیں کہتے کہ ہمیں اپنے دیش کی حفاظت میں سر دھڑ کی بازی لگا دینی چاہیے، ہندو مذہب کی تاریخ میں گیتا نے جس جنگ کی تفصیل بیان کی ہے، یعنی کورووں اور پانڈووں کی جنگ، اس میں کرشن جی، ارجن کو یہی صلاح دیتے ہیں کہ وہ اسے حق و باطل کی جنگ سمجھ کر کورووں کے خلاف صف آرا ہوں اور اس پر پانڈووں کے بادشاہ ارجن سے خدا کی مدد کا دعویٰ کرتے ہیں۔

ہندو مذہب میں منوجی کی ہدایات کی خاص اہمیت ہے۔ ان کا بیان ہے:

''روئے زمین کے جو حکمراں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی خواہش سے اپنی تمام قوتوں کے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور کبھی منہ نہیں موڑتے وہ مرنے کے بعد سیدھے بہشت کی طرف جاتے ہیں۔'' (۸۹/۷)

دیکھا آپ نے! قرآن نے تو اللہ کے راستہ میں جوابی جنگ پر جنت کا وعدہ کیا ہے، لیکن منوجی محض دوسروں کو نیچا دکھانے کے لیے اور ملک گیری کی غرض سے جنگ کرنے والوں کو بھی جنت کی خوشخبری سناتے ہیں۔ قرآن کے اس ارشاد پر تو داد دینی چاہیے، کہ اس نے ظالموں کے مقابلہ خود سپردگی کے بجائے، آخری حد تک جرأت و حوصلہ سے کام لینے کی تلقین کی ہے، کہ اگر مظلوموں میں یہ حوصلہ و ہمت اور جوش و جذبہ نہ ہو، تو ظالموں کا پنجہ استبداد سخت سے سخت تر ہوتا چلا جائے گا اور دنیا فساد کی آماجگاہ بن جائے گی۔

سا تویں آیت

مَلْعُونِيْنَ، اَيْنَمَا ثُقِفُوا اُخِذُوا وَقُتِّلُوا تَقْتِيْلاً ۔ (الاحزاب:۶۱)

پھٹکارے ہوئے، جہاں کہیں پائے جائیں گے پکڑ لیے جائیں گے اور ضرور قتل کر دیے جائیں گے۔

یہ بھی ان آیتوں میں سے ایک ہے جن کو وی، ایچ، پی نے قرآن مجید اور مسلمانوں

کے خلاف پروپیگنڈہ کا عنوان بنایا ہے، اس آیت کا اصل منشا کیا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے اس سے پہلی اور بعد کی آیت کے ساتھ اس کا ترجمہ دیکھنا چاہیے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

لَئِن لَّمْ يَنتَهِ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْمُرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا ۔ (الاحزاب:۶۰)

منافقین اور جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے اور جو لوگ مدینہ میں افواہ اڑاتے ہیں، اگر اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے تو ہم ان کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے تمہیں اٹھائیں گے، پھر وہ اس شہر میں آپ کے ساتھ کچھ ہی دنوں رہ سکیں گے۔

مَّلْعُونِينَ ۖ أَيْنَمَا ثُقِفُوا أُخِذُوا وَقُتِّلُوا تَقْتِيلًا ۔ (الاحزاب:۶۱)

ایسے لوگوں پر پھٹکار ہے، یہ جہاں پائے جائیں گے پکڑے جائیں گے اور بری طرح مارے جائیں گے۔ (احزاب:۶۱)

سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ ۖ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا (الاحزاب:۶۲)

ان سے پہلے مجرمین کے لیے بھی اللہ کا یہی دستور رہا ہے اور تم اللہ کے دستور میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔

یہ آیات بلکہ تقریباً یہ پوری سورت بنیادی طور پر پانچ ہجری کے واقعات، غزوۂ احزاب اور غزوۂ بنوقریظہ سے متعلق ہے، غزوۂ احزاب میں مسلمانوں کے پڑوسیوں نے ان کے ساتھ ناقابل عفو دغا سے کام لیا تھا، مسلمانوں کا یہودیوں سے یہ معاہدہ تھا کہ مدینہ پر جب بھی کوئی حملہ ہوگا تو ہم لوگ مل کر دشمن کا مقابلہ کریں گے، صورتِ حال یہ تھی کہ اہل مکہ نے اس جنگ میں بلاکسی اشتعال اور سبب کے نہ صرف خود حملہ کیا، بلکہ اپنے دوسرے حلیف قبائل کو بھی لے کر مدینہ پر چڑھ دوڑے، افرادی وسائل اور اسلحہ کے اعتبار سے مظلوم مسلمانوں اور حملہ آوروں کے درمیان اتنا فرق تھا کہ مسلمان جنگی تدبیر کے طور پر خندقیں کھودنے پر مجبور ہوگئے، اس موقع سے یہود مسلمانوں کی مدد تو کیا کرتے اور حسب

معاہدہ مدینہ کی حفاظت میں کیا حصہ لیتے کہ وہ غیر جانبدار بھی نہ رہ سکے اوران مشرکین کے ساتھ ہولیے، اس کے ساتھ ساتھ کچھ لوگ وہ تھے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے، لیکن ان کی ساری ہمدردیاں مسلمانوں کے دشمنوں سے تھیں، ان حالات میں مسلمانوں کی سب سے بڑی طاقت ان کا ایمان ویقین اور حوصلہ وہمت ہی تھی، یہ طرح طرح کی افواہیں اڑا کر مسلمانوں کو خوف میں مبتلا کرنا چاہتے تھے، تا کہ ان کے حوصلے ٹوٹ جائیں اور یہ نفسیاتی طور پر کمزور ہو جائیں، یہی دونوں طبقے ہیں جن کو' منافقین' سے تعبیر کیا گیا ہے، یہ مسلمانوں کو ذلیل ورسوا کرنے کے درپے بھی ہوتے تھے اور شریف مسلمان خواتین کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں اڑایا کرتے تھے، ایسی افواہوں سے انسان نفسیاتی الجھن میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

ان ہی گروہوں کے بارے میں قرآن مجید نے کہا کہ ان کا ایسے پڑوس اور بغلی دشمنوں کو اپنے ساتھ رکھنا مناسب نہیں؛ کیوں کہ دوست نما دشمن انسان کے لیے زیادہ خطرناک ہوتا ہے، کوئی صاحبِ انصاف دیکھے کہ جولوگ بظاہر کسی قوم کے ساتھ رہ کر یا کسی ملک کے شہری بن کر اسی قوم وملک کے خلاف سازشیں کرتے ہیں، ان کے دشمنوں سے خفیہ تعلقات رکھتے ہیں اور برے وقتوں میں سارے عہد و پیماں کو فراموش کر کے دشمنوں کے دوش بدوش کھڑے ہو جاتے ہیں، ایسے لوگوں کی سزا قتل اور پھانسی کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے؟؟

پھر قرآن مجید نے ان پر پھٹکار بھیجتے ہوئے مسلمانوں کو یہ حکم نہیں دیا کہ وہ ان پر ہلہ بول دیں، حالانکہ اگر قرآن نے ایسا کہا ہوتا تو بے جا نہیں ہوتا، لیکن یہاں حکم دینے کے بجائے صرف پیشین گوئی کی گئی ہے اور بار بار بے وفائی کرنے والوں کو سنبھلنے کا موقع دیتے ہوئے انتباہ دیا گیا ہے، کہ اگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے تو ان کا انجام دنیا میں بھی ہلاکت و بربادی ہے اور ایسے لوگوں کے ساتھ اللہ کی سنت یہی رہی ہے، یہ تحمل و بردباری قابل لحاظ ہے، اگر مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہوتا کہ تم کوئی مہلت دیے بغیر ان بغلی دشمنوں کا قلع قمع کردو، تب بھی یہ کوئی خلافِ انصاف بات نہیں ہوتی، لیکن ایسی بدعہدیوں

اور جفا شعاریوں کے باوجود سنبھلنے کا مزید موقع دیا جاتا ہے اور مسلمانوں کو قتال کا حکم دینے کے بجائے اللہ تعالیٰ کی سنت بیان کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے، وی، ایچ، پی کے لوگ ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ ہم لوگ اس ملک کے شہری ہیں اور اس زمین سے محبت رکھتے ہیں، اگر اس ملک میں رہنے والے اور اس سے ہر طرح کا فائدہ اٹھانے والے دشمن ملکوں کے ساتھ مل کر ملک کے خلاف سازشیں تیار کریں، جاسوسی کریں اور دشمنوں کے ساتھ جا ملیں تو آخر ان کی کیا سزا ہوگی؟ کیا انہیں گرفتار کرنا یا انہیں سزائے موت دینا خلافِ انصاف امر ہوگا؟ اور کیا آج دنیا کے مہذب قوانین میں ایسے شخص کے لیے بعینہٖ یہی سزا نہیں رکھی گئی ہے؟؟

کیا بہتر ہو کہ جناب اشوک سنگھل صاحب ان کلمات کو دیکھیں جو ہندو مذہبی کتابوں میں مخالفین اور دشمنوں کے بارے میں ہیں، بطورِ نمونہ اتھر وید کے چند منتر یہاں ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں:

☆ تمہاری گردنیں توڑ دے اے پشاچو! اور تمہاری پسلیاں چور چور کردے، اے یاتو دھانو! یہاں ہم شان کے ساتھ رہیں، اے متراوارونا! تو حریص راکشسوں کو مار بھگا، ان کو کوئی جائے پناہ اور کوئی اطمینان کی جگہ نہ ملے، بلکہ وہ سب چر پھٹ کر اکٹھے موت کے منہ میں چلے جائیں۔ (۲:۳۲:۶)

☆ ہمارے یہ دشمن بے ہاتھ کے ہو جائیں، ہم ان کے سست بازوؤں کو بے کار کردیں، اور اس طرح اے اندر! ہم ان کی ساری دولت آپس میں بانٹ لیں۔ (۳:۶۶:۶)

☆ یاتو دھانوں کے دلوں کو تیر سے چھید ڈال اور ان کے بازوؤں کو جو تجھ پر حملہ کرنے کے لیے اٹھیں توڑ دے، ان شیطانوں کے سامنے بھڑک کر اے اگنی! انہیں مار گرا، مردار خوار چتکبرے گدھ اسے کھائیں، اس پلید کو آدمیوں میں سے آدم خور کی طرح تاک کر اس کے تینوں اوپر کے اعضاء کو توڑ ڈال، اپنے شعلوں سے اس کی پسلیوں کو کچل دے، اے اگنی! اس کے نیچے کے اعضاء کو تین ٹکڑے کردے۔ (۸:۳:۶-۷-۱۰)

☆ اندرا اور سوما! تو خبیث دشمن کو جلا دے، تباہ کر دے، اے دیوتا! آ جو رنج پر رنج پہنچاتے ہیں، انہیں نیچا دکھا، ان احمقوں کو نیست و نابود کر دے، جلا ڈال، ذبح کر دے، ہمارے پاس دفع کر اور ان بندۂ شکم راکشسوں کو ٹکرے ٹکرے کر دے۔ (۱:۴:۳-رگ وید ۱:۷:۸:۵:۱)

یہ محض بطورِ نمونہ چند مثالیں دی گئی ہیں، ورنہ دنیا میں جتنے مذاہب موجود ہیں، ان کے صحیفے ___ (اس سے قطع نظر کہ وہ تحریف و تبدیلی سے محفوظ ہوں یا تحریف کا شکار ہو چکے ہوں) ___ دشمنانِ حق کے خلاف جہاد کی ترغیب کی تعلیمات سے بھری پڑی ہیں، لیکن قرآن مجید کا منشا بہر حال یہ نہیں ہے کہ جو غیر مسلم سامنے آئے مسلمان اسے تہہ تیغ کر دیں، بلکہ ان آیات میں وہ غیر مسلم مراد ہیں جو مسلمانوں سے برسرِ پیکار اور ان کو نیست و نابود کر دینے کے درپے تھے۔

آٹھویں آیت

يَـا أَيُّهَـا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ. (التحریم:۹)

اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے، ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ انتہائی بدترین ٹھکانہ ہے۔

ان آیات کا پس منظر بھی وہی ہے جس کا پہلے بار بار ذکر آ چکا ہے، دراصل اسلام میں غیر مسلموں کے تین گروہ کیے گئے ہیں: ایک وہ غیر مسلم جو مسلم ممالک میں ہوں، دوسرے وہ غیر مسلم جو مسلمانوں کے ساتھ ''بقائے باہم'' کے معاہدہ کے تحت رہتے ہوں، جیسا کہ آج کے جمہوری ممالک ہیں، پہلے گروہ کو ''ذمی'' اور دوسرے کو ''معاہد'' کہتے ہیں، ان دونوں کی جان و مال کو کسی بھی طرح کا نقصان پہنچانا ناجائز اور سخت گناہ ہے۔ تیسرے قسم کے وہ غیر مسلم ہیں جو مسلمانوں سے برسرِ جنگ ہوں، ان سے قتال کا حکم ہے اور یہ آیات انہیں کے سلسلہ میں ہے ___ اور یہ ایک فطری بات ہے کہ جب آپ پر کوئی شخص حملہ کرے تو آپ اپنی مدافعت کریں، تمام مذاہب اور قوانین میں انسان کو اپنی مدافعت اور حملہ آوروں کے

خلاف اقدام کی اجازت دی گئی ہے، جہاں تک ایسے ظالموں سے جنگ کی ترغیب دینے کی بات ہے تو یہ ــــ جیسا کہ عرض کیا گیا ــــ تمام ہی مذاہب میں موجود ہے۔

کرشن جی کا ہندو مذہب میں جو اہم مقام ہے عامی سے عامی ہندو بھی اس سے واقف ہے، لیکن ارجن ــــ جو کوروؤں سے جنگ نہیں کرنا چاہتا تھا ــــ کو جنگ پر آمادہ کرنے کے لیے انہوں نے کیسی کیسی ترغیب دی، دنیا اور آخرت کی فلاح دکھائی اور حیات وموت کے فلسفے بیان کیے، گیتا ان رزمیہ مضامین سے پُر ہے۔

مثلاً کرشن جی ارجن سے فرماتے ہیں:

> ہے ارجن! یہ جنگ ایک سورگ کا دروازہ ہے، جو تیرے لیے خود بخود کھل گیا ہے، ایسا موقع خوش قسمت کشتریوں ہی کو ملا کرتا ہے، لہٰذا اگر تو اپنے دھرم کی پیروی میں یہ جنگ نہ کرے گا تو اپنے دھرم اور شہرت کو برباد کرکے پاپ جمع کرے گا، بلکہ سب لوگ تیری کبھی نہ ختم ہونے والی مذمت کے گیت گاتے رہیں گے، یہ مذمت و بدنامی انسان کے لیے موت سے بدتر ہے۔ (۲:۳۲-۳۴)

غور کیجئے! کہ قرآن نے تو حملہ آوروں کی مدافعت کی ترغیب دی ہے، لیکن کرشن جی ارجن کو اقدامی حملہ کی ترغیب دیتے ہیں، اور کرشن جی کے دوسرے مواعظ جو گیتا میں مذکور ہیں، ان سے یہ بات جھلکتی ہے کہ اس کا مقصد اصل میں کشور کشائی، غلبہ وعزت اور ملک ومال کا حصول تھا نہ کہ ظالم کے ظلم کا سدِباب ــــ تو ایک طرف اس بے مقصد جنگ کی ترغیب کو تو برا نہیں سمجھا جائے اور دوسری طرف جارح کے خلاف اقدام کرنے کو بھی زیادتی سمجھا جائے، یہ کس قدر خلاف انصاف بات ہے!

مال غنیمت سے متعلق دو آیتیں

فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (الانفال:۶۹)

جو مالِ غنیمت تم نے حاصل کیا ہے، اسے پاکیزہ اور حلال سمجھ کر کھاؤ، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ معاف کرنے والے اور رحم کرنے والے ہیں۔

وَعَدَكُمُ اللَّهُ مَغَانِمَ كَثِيرَةً تَأْخُذُونَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هَذِهِ وَكَفَّ أَيْدِيَ النَّاسِ عَنكُمْ وَلِتَكُونَ آيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطاً مُّسْتَقِيماً. (الفتح:۲۰)

اللہ نے تم سے بہت سارے مالِ غنیمت کا وعدہ کیا ہے، جسے تم پاؤ گے، فوری طور پر تو فتح اس نے تمہیں عطا کردی اور لوگوں کے ہاتھ تمہارے خلاف اٹھنے سے روک دیئے؛ تاکہ یہ مومنوں کے لئے ایک نشانی بن جائے اور اللہ سیدھے راستے کی طرف تمہیں ہدایت بخشے۔

دونوں آیتوں میں مالِ غنیمت کا ذکر ہے، اس کا ترجمہ وی، ایچ، پی کے پمفلٹ میں لوٹ کے مال سے کیا گیا ہے اور یہ تصور دیا گیا ہے کہ مسلمان غیر مسلموں کا جو بھی مال لوٹ لیں، وہ ان کے لیے جائز اور حلال ہے — جیسا کہ بار بار واضح کیا جاچکا ہے — یہ محض ایک پروپیگنڈہ ہے، یہ آیات ہر غیر مسلم سے متعلق نہیں ہیں، بلکہ یہ ان لوگوں سے متعلق ہیں جو مسلمانوں سے برسر جنگ ہوں، کہ اگر مسلمان ان پر فتح پائیں اور جنگجو حضرات قید کر لیے جائیں، تو ان کے مال کا کیا حکم ہوگا؟ اس سلسلہ میں اصول یہ بیان کیا گیا کہ وہ مالِ غنیمت ہوگا، عربی زبان میں مشقت کے بغیر کسی چیز کے حاصل ہونے کو ''غنم'' (''غ'' پر پیش یا زبر) کہتے ہیں۔ (القاموس المحیط ۱۴۷۶) چوں کہ جنگ کے حاصل ہونے والے مال میں تجارت یا زراعت کی مشقت نہیں اٹھائی جاتی، اس لیے اس کو مالِ غنیمت کہتے ہیں، غنیمت کا ترجمہ ''لوٹ کے مال'' سے قطعاً درست نہیں، لوٹ تو ایک غیر قانونی طریقہ ہے، اسلام میں یہ حکم ہے کہ جب کوئی قوم مسلمانوں سے برسر جنگ ہو اور مسلمانوں کو فتح حاصل ہو تو جہاں تک ممکن ہو باغات اور کھیتیوں کو تاخت وتاراج نہ کیا جائے، مکانات منہدم نہ کیے جائیں، اپنے طور پر شکست خوردہ لوگوں کا مال لے کر استعمال نہیں کیا جائے، ایک غزوہ کے موقع سے فوجیوں نے کچھ بکریاں لوٹ لیں اور ذبح کر کے

پکانے لگے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بہت خفگی ظاہر فرمائی اور دیگیں الٹوادیں۔

مالِ غنیمت کے سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ مفتوحین کے مال حکومت کے پاس جمع کیے جائیں۔ اس میں سے پانچواں حصہ حکومت کے خزانہ میں محفوظ کردیا جائے اور اسے رعایا کی بھلائی کے لیے خرچ کیا جائے، یہ رقم مسلمان رعایا پر بھی خرچ ہوگی اور غیر مسلم رعایا پر بھی، اس زمانہ میں فوجیوں کے لیے الگ تنخواہ نہیں ہوا کرتی تھی اور ان میں جنگ میں حاصل ہونے والے مال کے بقیہ چار حصے تقسیم کردیے جاتے تھے، بعض صورتوں میں حکومت اپنے اختیارِ تمیزی اور عوامی مصلحت سے کسی مال کو روک بھی سکتی ہے، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عراق کی مفتوحہ اراضی مجاہدین کے درمیان تقسیم نہیں فرمائی، بلکہ بیت المال کی ملکیت میں باقی رکھا، بہر حال تقسیم کے بعد جو مال جس کے حصہ میں پڑے گا، وہ اس کا مالک سمجھا جائے گا، اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مالِ غنیمت ہر غیر مسلم کے مال کو نہیں کہیں گے، بلکہ دشمن ملک کے حاصل شدہ مال کو مالِ غنیمت کہا جائے گا اور ایسا بھی نہ ہوگا کہ جس کے ہاتھ میں جو آئے وہ اس پر قابض ہوجائے، بلکہ قانونی طریقہ پر ہی کوئی شخص اس مال کا مالک ہوسکتا ہے۔

اب اس بات کی وضاحت بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ مالِ غنیمت کا تصور دنیا کے تمام نظام ہائے قوانین اور مذاہب میں رہا ہے، اسلام سے پہلے عرب کے قریب ایرانیوں اور رومیوں کی حکومت تھی، ایرانیوں کے یہاں بھی یہی اصول تھا کہ وہ مفتوحین کے مال پر قبضہ کرلیتے تھے، رومی تورات کے قانون کو مانتے تھے، یہودی بھی اسی قانون پر عقیدہ رکھتے ہیں، اب دیکھئے کہ بائبل میں مالِ غنیمت کی بابت کیا کہا گیا ہے؟

> اور جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضہ میں کردیوے، تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر، مگر عورتوں اور لڑکوں اور مویشی کو اور جو کچھ اس شہر میں ہو، اس کی ساری لوٹ اپنے لیے لے اور تو اپنے دشمن کی اسی لوٹ کو جو خداوند تیرے خدا نے تجھے دی ہے، کھائیو۔" (استثناء ۲۰: ۱۲-۱۴)

توریت میں جن جن مفتوحین کو لوٹنے کا ذکر ہے، یہاں ان سب کا تذکرہ درازی

کلام کا باعث ہوگا، لیکن اس سلسلہ میں خاص طور پر ''گنتی'' اور ''استثناء'' نامی صحائف کو پڑھا جا سکتا ہے۔

اب خود ہمارے ہندو بھائی ایک نظر اپنی مذہبی کتابوں پر ڈالیں۔ رگ وید میں ہے:

اے اگنی! تیرے مالدار پجاری خوراک حاصل کریں اور امراء بڑی عمریں پائیں، ہم اپنے دشمنوں سے لڑائی میں مالِ غنیمت حاصل کریں اور دیوتاؤں کو ان کا حصہ نذر کریں، اے اگنی! ہم تیری مدد سے گھوڑوں کے ذریعہ گھوڑے، آدمیوں کے ذریعہ آدمی اور بہادروں کے ذریعہ بہادر فتح کریں۔'' (۱:۷۳، ۹،۵)

یجروید میں ہے:

یہ اگنی ہم کو وسیع مکان اور آرام و آسائش بخشے اور ہمارے دشمنوں کو ہمارے آگے مارتے بھگائے چلے، وہ مالِ غنیمت حاصل کرنے کی جنگ میں مالِ غنیمت لوٹے، وہ اپنی فاتحانہ پیش قدمی میں دشمنوں کو زیر کرے۔'' (۸:۴۴)

سام وید میں ہے:

اے چابکدست بہادرو! کنوا کے بیٹوں کے ساتھ بے دھڑک ہوکر ہزار دو ہزار مالِ غنیمت لوٹ، اے سرگرم کار مگھون! پرشوق دعاؤں کے ساتھ ہم زرد رنگ کے مال اور گایوں کے ایک بڑے گلے کی تمنا کرتے ہیں۔

(۳ : ۱۲ : ۴ : ۲)

اتھروید میں کہا گیا ہے:

دشمن خالی ہاتھ ہو جائے، ہم ان کے اعضاء کو مفلوج کر دیں اور اس طرح اے ذوالجلال سپہ سالار اندر! ہم ان کی ساری دولت آپس میں سینکڑوں کی طرح سے بانٹ لیں۔ (۶ : ۶۶ : ۳)

پنڈت کشیم کرن داس ترویدی جی نے اس اشلوک کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے:

فاتح بہادر دشمنوں کو فتح کر کے سپہ سالار کی ہدایت کے مطابق حکومت کا حصہ

نکال کر ان کے مال دولت کو تقسیم کر لیں۔

(قرآن مجید پر اعتراضات: ۱۷بحوالہ ہندی ترجمہ کشیم کرن داس)

اتھرو وید میں ایک اور اشلوک اس طرح ہے:

اے سپہ سالار! اپنے بہادروں میں طاقتور شخص کو زرہ پہنا دے، اور دشمنوں میں ہرن کی طرح بزدلی پیدا کر دے، دشمن الٹے منہ چلا جائے، زمین ہماری طرف آ جائے۔(۶ : ۶۷ : ۳)

منوسمرتی ہندو مذہب میں قانون کی کتاب کے درجہ میں ہے اور اسی قانون پر ہندو سماج کی اور نظامِ حکومت کی اساس ہے، منو جی فرماتے ہیں:

''رتھ، گھوڑے، ہاتھی، چھتر، مال و دولت، جانور، عورت، گڑ، نمک، مادی چیزیں، تانبا، پیتل وغیرہ چیزیں ان میں جس چیز کو جو جیت کر لاتا ہے، وہ اسی کا ہوتا ہے۔'' (منوسمرتی ۷: ۹۶،۹۵)

آج بھی جب کوئی ملک دوسرے ملک پر فتحیاب ہوتا ہے تو مفتوحہ علاقوں میں جو چیز فاتحین کو ہاتھ آتی ہے، وہ اسے اپنی صوابدید سے تقسیم کرتے یا استعمال کرتے ہیں، لیکن اسلام میں یہ ضروری نہیں کہ لامحالہ مفتوحین کے مال پر قبضہ کر ہی لیا جائے، ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ مسلم حکومت ان چیزوں کو مفتوحین کی ملکیت میں رہنے دیں، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کے ساتھ غزوۂ خیبر کے موقع پر کیا تھا۔

جزیہ

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ ۔ (التوبہ:۲۹)

جو کتاب والے اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں، اللہ اور اس کے رسول کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام نہیں ٹھہراتے ہیں، اور دین حق کو اختیار نہیں کرتے ہیں، ان سے جنگ کرو، یہاں تک کہ وہ رعیت بن کر جزیہ دینے لگیں۔

اس میں وی، ایچ، پی والوں نے "حَتّٰی یُعْطُوْا الْجِزْیَةَ عَنْ یَدٍ وَّ هُمْ صَاغِرُوْنَ" کا ترجمہ کیا ہے: "ان سے لڑو یہاں تک کہ وہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھوں سے جزیہ دینے لگیں"؛ حالانکہ یہاں "صاغرون" سے مراد فاتحین کے اقتدار کو تسلیم کرنا ہے، یعنی مفتوح فاتح کے مقابلے اپنے رعایا ہونے کی حیثیت کا اعتراف کر لے، جیسا کہ آج بھی ہتھیار ڈالنے والے ممالک اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہیں، اس کا مقصد تحقیر و تذلیل نہیں ہے، جیسا کہ وی، ایچ، پی کے پروپیگنڈہ باز ترجمہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

جزیہ سے مراد وہ خصوصی ٹیکس ہے، جو اسلامی حکومت غیر مسلم رعایا سے ان کی جان و مال کی حفاظت کے طور پر وصول کرتی ہے، صورتِ حال یہ ہے کہ مسلمانوں پر زکوٰۃ واجب ہے، جسے حکومت وصول کرتی ہے، اگر غیر مسلموں پر بھی زکوٰۃ واجب قرار دی جاتی تو یہ انہیں ایک اسلامی عمل پر مجبور کرنے کے مترادف اور مذہبی آزادی کے مغائر ہوتا، اس لیے ان پر ایک جداگانہ ٹیکس جزیہ کے نام سے لگایا گیا، جو ان کی جان و مال کے حفاظتی نظام کا معاوضہ ہے، یہ ان کے حالتِ کفر میں ہونے کا تاوان نہیں، اگر ایسا ہوتا تو عورتوں، بچوں، بوڑھوں، بیماروں، معذوروں، بے روزگاروں اور مذہبی طبقہ یعنی پادری، پنڈت وغیرہ سبھوں پر واجب قرار دیا جاتا، لیکن ان حضرات کو جزیہ سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے، اس لیے اس کی حیثیت محض ایک ٹیکس کی ہے نہ کہ تاوان کی۔

پھر اس جزیہ کی مقدار بھی کس قدر معمولی ہے؟ کم آمدنی والوں کے لیے سالانہ ۱۲/ درہم، متوسط آمدنی والوں کے لیے سالانہ ۲۴/ اور زیادہ آمدنی والوں کے لیے ۴۸/ درہم۔ ۱۲/ درہم ۳ تولہ سے کچھ کم چاندی ہوتی ہے، موجودہ نرخ کے لحاظ سے ۱۲ درہم ۲۶۵ روپیہ سے کچھ کم و بیش ہے۔ آپ حضرات غور کریں کہ اگر کوئی مملکت کسی شہری کی حفاظت اور سیکوریٹی پر سال بھر میں اتنا حقیر معاوضہ وصول کرے تو کیا یہ زیادتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہماری حکومت اتنے پیسے لے کر باشندگانِ ملک کی حفاظت کا انتظام کر دے، اور ان کے تحفظ کی ضمانت قبول کرے تو ہم شکر گذار ہوں گے، یہ ہے اس جزیہ کی حقیقت جس کو لے کر معاندین نے ایک طوفان کھڑا کیا ہوا ہے اور اس کو اسلام کے خلاف ظلم و زیادتی،

تشدد اور نارواداری کا عنوان دیا گیا ہے۔

مشرکین ناپاک ہیں؟

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَـٰذَا وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ إِن شَاءَ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ۔ (التوبہ:۲۸)

''اے ایمان والو! شرک کرنے والے (مورتی پوجک) لوگ ناپاک ہیں۔''

اس آیت کے سلسلہ میں چند نکات ملحوظ رکھے جانے چاہئیں:

(۱) یہاں مشرک سے صرف بت پرست (مورتی پوجک) مراد نہیں ہیں، جیسا کہ وی، ایچ پی والوں نے آیت کا ترجمہ کیا ہے، بلکہ وہ تمام لوگ شامل ہیں جو خدا کی ذات یا اس کی مخصوص صفات واختیارات میں دوسروں کو شریک ٹھہرائیں، خواہ وہ بت کا پرستار ہو، یا کسی پیغمبر کو خدا کا درجہ دیتا ہو، یا اللہ کے کسی نیک بندہ کو خدا کی قدرت واختیار میں ساجھے دار سمجھتا ہو، جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، لیکن انہوں نے خدانخواستہ غیر اللہ کو خدا کا درجہ دے رکھا ہو اور رسول اور اولیاءؒ کی ذات میں وہ اختیارات مانتے ہوں، جو اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہیں، تو وہ بھی مشرک کا مصداق ہیں۔

(۲) مشرکین کو ناپاک کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کا جسم ناپاک ہے، ان کے کپڑے ناپاک ہیں، یا ان کا جھوٹا ناپاک ہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں کی مہمان نوازی کی ہے، خود ان کی دعوت قبول فرمائی ہے، مسجد نبویؐ میں ان کو ٹھہرایا ہے، اپنے بستر پر انہیں بٹھایا اور سلایا ہے، اگر انہیں جسمانی اعتبار سے ناپاک سمجھا جاتا تو کس طرح آپؐ ایسا عمل فرماتے، اس لیے یہاں عقیدہ اور فکر کی ناپاکی مراد ہے، یہ ایسے ہی ہے جیسے آپ کسی شخص کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ ناکام عزائم رکھتا ہے، یا آپ کہتے ہیں کہ فلاں دہشت گردوں کے ناپاک منصوبے ناپاک کردیے گئے، یہاں ناپاکی سے عمل اور سوچ کی غلط اور مبنی برخطا ہونے کا اظہار کیا جاتا ہے، گویا اس آیت میں شرک

کے نہایت غلط اور خلافِ واقعہ عمل ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

(۳) اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توحید کا اثبات اور شرک کی نفی صرف اسلام ہی نے نہیں کی ہے، بلکہ یہ تمام ہی مذاہب کی اصل تعلیمات ہیں، بائبل میں جگہ جگہ شرک کی مذمت آئی ہے اور ہمارے عیسائی بھائی جو آج تین کے مجموعہ کو خدا مانتے ہیں ،ان کے پاس اس دعویٰ کے لیے بائبل کا کوئی صریح فقرہ موجود نہیں ہے، اس لیے وہ تاویل کرتے ہیں کہ یہ تین مل کر ایک ہی ہیں، ہندو مذہبی کتابوں میں بھی خدا کے بارے میں بہ تاکید وحدانیت کا ذکر ہے، شرک کی نفی ہے، کہا گیا ہے کہ خدا جسم والا نہیں ہے، وہ تنہا پورے عالم کا احاطہ کیے ہوئے ہے، اس سلسلہ میں پنڈت دیانند جی سرسوتی نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ''ستیارتھ پرکاش'' میں بت پرستی کی تردید میں ہندو مذہبی کتابوں کے جو حوالے نقل کیے ہیں، وہ بہت ہی چشم کشا ہیں اور جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اصل ہندو مذہب توحید ہے نہ کہ شرک ، اسی کتاب سے استفادہ کرتے ہوئے ویدوں کے چند حوالے یہاں ذکر کیے جاتے ہیں:

☆ وہ محیط، پاک اور جسم سے خالی ہے۔'' (یجروید: ۴۰: ۸)

☆ میں افضل ترین قوت و نعمت کا منبع ، سورج کی طرح تمام عالم کو منور کرتا ہوں، میں نہ کبھی مغلوب ہوتا ہوں اور نہ مرتا ہوں ، یہ تمام عالم جو نعمتوں کا مخزن ہے اس کا خالق میں ہوں، تم مجھے ہی اس دنیا کا خالق اور مبتدا سمجھو، اے اہل علم! تم نعمت و حشمت کے حصول کے لیے کوشاں رہ کر علم وغیرہ نعمتوں کے لیے مجھ ہی سے التجا کرو، میری رفاقت سے کبھی روگرداں نہ ہو۔'' (رگ وید، ۵: ۴۸: ۱۰)

رگ وید ہی کے یہ ارشادات کس قدر بصیرت مندانہ اور عقیدۂ توحید کے بارے میں واضح ہیں:

☆ اے بنی نوع انسان! میری حقیقی حمد و ثنا ، راست گوئی ہے، ایسی حمد کرنے والے انسان کو میں ازلی علوم وغیرہ نعمتیں عطا کرتا ہوں اس لیے عالم میں جو اشیاء موجود ہیں۔ ان کا خالق اور قیوم میں ہوں ، اس لیے تم مجھے چھوڑ کر کسی اور کی

عبادت مت کرو اور نہ کسی کو میری جگہ معبود مانو اور جانو۔'' (اتھروید: ۱۰/ ۴۹:۱)

پنڈت سرسوتی جی نے کینو پنشد (۶:۱) کے حوالہ سے اللہ تعالیٰ کی صفات کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

> جسے آنکھ سے نہیں دیکھا جا سکتا، بلکہ آنکھ جس کی قدرت سے دیکھنے کے قابل ہوتی ہے، اسے ہی تم خدا سمجھو، آنکھ سے دکھلائی جانے والی جن چیزوں کی لوگ عبادت کرتے ہیں، وہ خدا نہیں ہیں۔

ہندو مذہب کی اہم معتبر کتابوں کی عبارتوں سے صاف ظاہر ہے کہ خدا کو ایک ماننا اور اس میں کسی اور کو شریک نہیں ٹھہرانا، یہی اصل ہندو دھرم ہے، تو مشرکوں کو ناپاک کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جو اپنے آپ کو ہندو کہے اور اصل مذہب پر عمل نہ کرے، جو اپنے آپ کو یہودی کہے اور اصل یہودی مذہب پر عمل نہ کرے، جو اپنے آپ کو عیسائی کہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اصل تعلیمات پر عمل نہ کرے، جو اپنے آپ کو مسلمان کہے اور اس کا عقیدہ اسلامی تعلیمات کے مطابق نہ ہو، وہ اپنے خیال وعقیدہ کے اعتبار سے ناپاک ہیں۔

(۴) جو لوگ کسی دھرم کا نام لیتے ہوں اور اس کی اصل تعلیم پر عمل نہ کرتے ہوں ان کو ہر مذہب میں عقیدہ کے بگاڑ کے اعتبار سے خراب نام دیے گئے ہیں، جن لوگوں نے بائبل کا مطالعہ کیا ہے، وہ اس سے خوب واقف ہیں کہ اس کتاب میں بہت سے مواقع پر شرک کرنے والے کو کسبی، فاحشہ، زانی، بدکار وغیرہ کے لفظ سے ذکر کیا گیا ہے، دھرم پر عمل کرنے والوں اور نہ کرنے والوں کے درمیان فرق ہندو مذہب کی کتابوں میں بھی زیادہ سخت لب ولہجہ میں ملتا ہے، ''دسیو'' اور ''داس'' کے نام سے ہندوستان کے اصل کالے باشندوں کو ویدوں میں یاد کیا جاتا ہے، جو آریہ لوگوں کے مذہب پر نہیں تھے، اس قوم کے بارے میں ویدوں کے کلمات ملاحظہ کیجئے:

☆ ہمارے گرد وہ دسیو ہیں جن کا کوئی دھرم نہیں ہے، عقل سے محروم، انسانیت سے خارج۔ (رگ وید: ۸:۲:۲۲:۱۰)

☆ اے بہادر! تو نے لڑائیوں میں بیل جیسے جبڑے والے داسوں کے جادو ٹونے تک کو مغلوب کر لیا۔ (رگ وید: ۷:۴۹:۴)

تو اپنے ہتھیار سے نکٹے دسیوں کو قتل کرتا ہے۔ (رگ وید: ۵:۲۹:۱)

کہیں ان لوگوں کو ''سیاہ رو'' مخلوق سے تعبیر کیا جاتا ہے، (رگ وید: ۶:۲۱) کہیں انہیں ''گھن کھائے درخت'' کہا جاتا ہے۔ (رگ وید: ۸:۴:۶) کہیں ''کالے غولوں'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، (سام وید: ۴:۲:۴:۱۱) ویدوں میں اُدھرمی لوگوں کے لیے حریص راکشش اور خبیث دشمن وغیرہ کے نام دیے جاتے ہیں۔

اب انصاف کی نظر سے دیکھا جائے کہ قرآن نے تو ایک جگہ مشرکین کو ناپاک کہا ہے، لیکن ویدیں اس مذہب کے مخالفین کو خبیث، بیل جیسے جبڑے والے نکٹے، سیاہ رو، عقل سے محروم، انسانیت سے خارج، بدذات، پاپی، حریص، راکشش وغیرہ کے الفاظ بے تکلف کہتی ہیں، بلکہ اتھر وید میں آدھرمی لوگوں کے لیے بعینہٖ ''ناپاک'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے:

> یا تو دھانوں کے دلوں کو تیر سے چھید ڈال اور ان کے بازوؤں کو جو تجھ پر حملہ کرنے کے لیے اٹھیں، توڑ دے، ان شیطانوں کے سامنے بھڑک کر اے اگنی! انہیں مار گرا، مردار خوار چتکبرے گدھ اسے کھائیں، اس ''پلید'' کو آدمیوں میں سے آدم خور کی طرح تاک کر اس کے تینوں اوپر کے اعضاء کو توڑ ڈال۔ (اتھر وید: ۸:۳:۶-۷-۱۰)

(۵) یہ تو وہ القاب ہیں جو ادھرمی لوگوں کو دیے گئے ہیں، لیکن منوجی کی تعلیمات میں عقیدۂ وفکر کی بنیاد پر نہیں، بلکہ نسل و خاندان کی بنیاد پر شودروں کو نہایت ذلیل وحقیر القاب دیے گئے ہیں اور ان کے بارے میں وہ احکام دیے گئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شودر جسمانی طور پر پیشاب، پائخانہ کی طرح ناپاک اور قابل اجتناب ہیں، اس سلسلہ میں میں ہندو مآخذ میں اتنا کچھ ہے کہ اگر ان سب کو نقل کیا جائے تو ایک رسالہ بھی ناکافی ہے، چند نمونے یہاں ذکر کیے جاتے ہیں:

- ہاتھی، گھوڑے، شودر قابل نفرت ملیچھ لوگ، شیر، تیندوے اور سور (پنر جنم کے) وہ ادنیٰ درجے ہیں، جو تاریکی سے حاصل ہوتے ہیں۔ (منوسمرتی، ۴۳:۱۲)
- شودر کا کھانا نہ کھائے۔'' (منوسمرتی: ۲۱۱:۴)
- شودر کی لڑکی کو اپنے پلنگ پر بٹھانے سے نرک (دوزخ) میں چلا جاتا ہے۔

(منوسمرتی ۱۷:۳)

- اگر برہمن بھولے سے شودر کا کھانا کھالے تو تین دن تک اُپاس کرے (بھوکا رہے) اور اگر جان بوجھ کر کھالے تو اس کا کفارہ وہی ادا کرے جو حیض، پائخانہ، یا پیشاب پینے اور کھانے والے کے لیے مقرر ہے۔'' (منوسمرتی: ۲۲۲:۴)
- غذا سور کی بدبو سے، کتے کی نظر سے اور شودر کے چھونے سے گندہ ہو جاتی ہے۔

(منوسمرتی: ۲۹۱:۳)

ان تصریحات سے ___ جو نہ صرف منوشاستر میں ہیں، بلکہ ایسی بعض عبارتیں ویدوں میں بھی موجود ہیں ___ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انسانیت کے ایک طبقہ کو ہندو مذہب کے موجودہ ماخذ کی روایت کے مطابق کس نظر سے دیکھا گیا ہے؟

تاہم مجھے یقین ہے کہ اصل ہندو مذہبی کتابوں میں ایسی ظلم و زیادتی کی باتیں اور غیر انسانی تصورات نہیں ہوں گے، یہ مذہب کی اصل کتابوں میں آمیزشوں اور ملاوٹوں کا نتیجہ ہوگا، ہمیں ہندو مذہب میں ذکر کیے جانے والے بزرگوں اور علماء کے بارے میں یہ بدگمانی نہیں ہے کہ انہوں نے ایسی غیر انسانی باتیں کہی ہوں گی، بلکہ یقیناً ایسی غلط باتیں کچھ لوگوں نے دوسروں کے استحصال اور اپنی مقصد براری کے لیے ان کی طرف منسوب کردی ہوں گی۔

غیر مسلموں سے دوستی

اس پمفلٹ میں ان آیات کو بھی خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے جن میں کفار کی عداوت اور ان سے دوستی نہیں رکھنے کا ذکر ہے، وہ آیات اس طرح ہیں:

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَقْصُرُواْ مِنَ الصَّلاَةِ إِنْ خِفْتُمْ أَن يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُواْ إِنَّ الْكَافِرِينَ كَانُواْ لَكُمْ عَدُوّاً مُّبِيناً. (النساء:۱۰۱)

اور جب تم ملک میں سفر کرو تو تم پر حرج نہیں ہے کہ تم نماز میں قصر کرو، اگر تم کو اندیشہ ہو کہ کافر تم کو ستاویں گے، بیشک کافر تمہارے کھلے دشمن ہیں۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيراً مِّمَّا كُنتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ قَدْ جَاءكُم مِّنَ اللّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِينٌ. (المائدہ:۵۱)

اے ایمان والو! تم یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست نہ بناؤ، یہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے جو کوئی ان کو دوست بنائے گا، وہ انہیں میں سے ہوگا، بیشک اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ لاَ تَتَّخِذُواْ الَّذِينَ اتَّخَذُواْ دِينَكُمْ هُزُواً وَلَعِباً مِّنَ الَّذِينَ أُوتُواْ الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ أَوْلِيَاء وَاتَّقُواْ اللّهَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ. (المائدہ:۵۷)

اے ایمان والو! جن لوگوں کو تم سے پہلے کتاب (آسمانی) مل چکی ہے اور وہ ایسے ہیں کہ انہوں نے تمہارے دین کو ہنسی کھیل بنا رکھا ہے، ان کو اور کافروں کو دوست نہ بناؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو، اگر تم ایمان والے ہو۔"

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ لاَ تَتَّخِذُواْ آبَاءكُمْ وَإِخْوَانَكُمْ أَوْلِيَاء إَنِ اسْتَحَبُّواْ الْكُفْرَ عَلَى الإِيمَانِ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ. (التوبہ:۲۳)

اے ایمان والو! اپنے باپوں اور بھائیوں کو اپنا دوست مت بناؤ، اگر وہ ایمان کے مقابلہ کفر کو پسند کریں اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی کرے گا، تو ایسے ہی لوگ ظالم ہوں گے۔

پہلی آیت (النساء:۱۰۱) میں بھی اہل مکہ کا بیان ہے کہ یہ تمہارے کھلے ہوئے اور سخت دشمن ہیں، کہیں مسلمان کسی مرحلہ پر دھوکہ نہ کھا جائیں اور ان کی دوست نما دشمنی کا شکار نہ ہو جائیں، یہ آیت بھی انہیں مشرکین مکہ سے متعلق ہے۔

چنانچہ اس آیت کے بعد نمازِ خوف کا طریقہ بیان کیا گیا ہے۔(نساء:۱۰۲) کہ جب جنگ کی حالت ہو اور دونوں طرف سے فوجیں صف آرا ہوں، اس وقت مسلمانوں کو کس طرح نماز ادا کرنی چاہیے؟ کیوں کہ اہل مکہ سے اس وقت پے در پے معرکے در پیش تھے، یہ آیت تمام غیر مسلموں سے متعلق نہیں ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اس کی واضح دلیل ہے، آپؐ نے مدینہ میں یہودیوں سے معاہدہ کیا، نجران کے عیسائیوں سے معاہدہ کیا، بنوخزاعہ کافر تھے، لیکن مسلمانوں کے حلیف اور دوست تھے، اس طرح کے معاہدے آپؐ نے بعض اور غیر مسلم قبائل سے بھی کیے ہیں، اگر کفار سے مطلقاً دوستی کی اجازت نہ ہوتی اور وہ سب کے سب دشمن قرار دیئے جاتے، تو آپؐ نے کیسے ان غیر مسلم قبائل کو اپنا حلیف بنایا ہوتا؟

دوسری اور تیسری آیت کا پس منظر یہ ہے کہ مسلمان بار بار یہودیوں سے معاہدہ کرتے تھے اور یہودی اس وعدہ کی خلاف ورزی کرتے تھے، یہاں تک کہ غزوۂ خندق میں تو انہوں نے اہل مکہ کے ساتھ مل کر مسلمانوں کی بیخ و بن اکھاڑ دینے کی کوشش کی، یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو متہم کرتے تھے اور ولد الزنا ٹھہراتے تھے، حضرت مریم علیہا السلام پر تہمت لگاتے تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر لعنت بھیجتے تھے، قرآن مجید نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نبی ہونے کو پوری قوت کے ساتھ بیان کیا، ان پر اور ان کی والدہ پر جو تہمتیں لگائی جاتی تھیں، اس کی تردید کی، لیکن ہوا یہ کہ وہ بجائے اس کے کہ مسلمانوں کو تقویت پہنچاتے اور اسلام کی دعوت کو قبول کرتے، اپنے پیغمبر کو گالی دینے والے یہودیوں کے ساتھ مل بیٹھے، اس لیے مسلمانوں سے کہا گیا کہ وہ انہیں اپنا رازدار نہ بنائیں، کیوں کہ ایسے شدید اختلاف کے باوجود مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنے میں یہود و نصاریٰ اور کفارِ مکہ ایک دوسرے کے ساتھ ہیں، عقیدۂ و مذہب کے تضاد کی وجہ سے

مسلمان انہیں اپنا راز دار بنا کر کہیں نقصان نہ اٹھالیں۔

پانچویں آیت میں مسلمانوں سے خطاب ہے اور ان سے کہا گیا ہے کہ بہ مقابلہ خونی رشتہ کی محبت کے مذاہب اور عقیدہ کا تعلق زیادہ اہم ہے، یعنی اگر کوئی شخص ایمان لے آیا ہو، اس کے آباء واجداد، بھائی بہن کفر کی حالت میں ہوں، تو ایسا نہ ہو کہ اپنے اعزہ اور اقارب کی محبت اور ان کا تعلق اسے حق کی راہ سے منحرف کردے؛ کیوں کہ جہاں حق اور ناحق کا مقابلہ ہو اور دو ایسی باتوں کا ٹکراؤ ہو جن میں ایک طرف حق اور سچائی ہو اور دوسری طرف رشتۂ قرابت، تو سچائی کو رشتوں پر ترجیح دینی چاہیے۔ یہ تو اعلیٰ اخلاقی تعلیم ہے اور ہر قوم کے لیے ہے کہ جس چیز کو وہ حق اور انصاف سمجھتی ہو اسے دوسرے تمام تعلقات پر غالب رکھے۔ اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو غیر مسلم اقرباء ہوں ان سے مسلمانوں کو نفرت کرنی چاہیے، ان کے ساتھ حسن سلوک نہیں ہونا چاہیے، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر حال میں رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کا حکم دیا ہے، آپؐ نے غیر مسلم کی عیادت کی ہے، مکہ میں قحط پڑا تو آپؐ نے کفارِ مکہ کے لیے امداد بھجوائی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک مشرک عزیز کے لیے ریشمی عباء بھیجی، بعض صحابہؓ کی والدہ ان کے مسلمان ہونے پر ناراض تھیں اور انہوں نے احتجاجاً کھانا کھانا چھوڑ دیا تھا، آپؐ نے انہیں نصیحت کی کہ اسلام پر قائم رہنا بھی ہے، لیکن اس کا بھی لحاظ رکھنا ہے کہ والدین کے ساتھ بدسلوکی نہ ہو۔ اگر غیر مسلم رشتہ داروں سے نفرت کی تعلیم دی گئی ہوتی، تو مسلمانوں نے اس طرح حسن سلوک کیوں کیا ہوتا؟ اصل یہ ہے کہ موالات سے ہر طرح کی دوستی اور تعلق مراد نہیں ہے، بلکہ ایسی دوستی مراد ہے جو انسان کے فکر و عمل پر اثر انداز ہونے لگے اور کسی گروہ کی رازدارانہ باتیں جن کا دوسروں تک پہنچنا اس گروہ کے لیے ضرر کا باعث بن سکتا ہو، پہنچنے نہ دے، ایسے گہرے تعلق کو اصل میں ''موالات'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ تعلق کے مختلف درجات ہیں، ان کو ایک ممتاز صاحبِ علم حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس طرح بیان کیا ہے کہ تعلقات چار طرح کے ہو سکتے ہیں: مدارات، مواساۃ، معاملات اور موالات۔ مدارات: دوستانہ برتاؤ اور خوش

خلقی کا نام ہے، یہ غیر مسلموں کے ساتھ نہ صرف یہ کہ جائز ہے، بلکہ انہیں اس کا حکم دیا گیا ہے، مواساۃ: غمگساری ونفع رسانی اور مالی تعاون سے عبارت ہے، غیر مسلموں کے ساتھ بھی مواساۃ کا حکم دیا گیا ہے، تیسرے معاملات، یعنی مالی کاروبار جیسے تجارت، ملازمت وغیرہ، اس میں بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کوئی فرق نہیں، چوتھا درجہ موالات کا ہے، موالات سے مراد ایسی دوستی ہے کہ آدمی دوسرے کی تہذیبی وتمدنی اثرات کو قبول کرنے لگے اور اپنے راز ہائے سربستہ کو دوسروں تک پہنچائے جس سے اسے مضرت بھی پہنچ سکتی ہے، قرآن نے اسی درجہ تعلق ''موالات'' سے منع کیا ہے، ا **لاتجعلوا خاصتکم و بطانتکم منھم** ۔(تفسیر قرطبی: ۲۷۲/۳) اسی ممانعت کا نتیجہ ہے کہ مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان شادی بیاہ کا تعلق نہیں ہوسکتا، وہ ایک دوسرے سے میراث کے حق دار نہیں ہوتے۔

پس دو باتیں ان آیات کے بارے میں ذہن میں رکھنے کی ہیں: اوّل یہ کہ یہ آیات بھی ان کفار کے پس منظر میں ہیں جن سے اس وقت مسلمانوں کا سابقہ تھا، دوسرے اس میں ہر طرح کی دوستی کی ممانعت نہیں ہے، بلکہ ایسی دوستی کی ممانعت ہے جس میں مسلمان اپنی تہذیبی اور تمدنی قدروں سے محروم ہوجائیں، وہ دوسری قوموں کے ساتھ تہذیبی اور فکری اعتبار سے جذب ہونے لگیں، یا جن لوگوں سے ان کا اختلاف ہے ان تک اپنے ایسے راز واسرار کو پہنچانے لگیں جو پوری قوم کے لیے نقصان دہ اور مضرت رساں ہوں ___ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی قوم اگر اپنی تہذیب کی حفاظت اور بچاؤ کی کوشش کرتی ہے، تو یہ کوئی مذموم وناپسندیدہ بات نہیں، آج تو تمام تہذیبی اکائیوں کے لیے عالمی سطح پر اس حق کو تسلیم کیا جاتا ہے، کہ اپنے تمدن کی حفاظت کریں اور اسے کھونے نہ پائیں ۔خود ہمارے اس ملک میں چھوٹی چھوٹی تہذیبی اکائیوں کی رعایت سے بعض ریاستوں میں خصوصی قوانین ہیں، وہاں دوسرے لوگ زمینیں بھی نہیں خرید سکتے، نیز ملکی قوانین کی جگہ بعض امور میں ان کے روایتی قانون کو ترجیح دی جاتی ہے، اس لیے یہ کسی گروہ کے خلاف نفرت کی تعلیم نہیں، بلکہ مسلمانوں کو مختلف مذہبی اکائیوں کے ساتھ رہتے

ہوئے بھی اپنی ثقافت کو برقرار رکھنے اور اپنے مذہبی اقدار پر ثابت قدم رہنے کی تعلیم ہے۔

اب یہ بھی ملاحظہ کیجئے کہ خود ہندو مذہب میں جو لوگ ادھرمی اور ہندو مذہب پر ایمان نہ رکھنے والے سمجھے جاتے تھے، ان کے لیے عام طور پر ''دشمن'' ہی کی تعبیر اختیار کی جاتی ہے، بلکہ اس طرح ان کا ذکر کیا جاتا ہے، جیسے ان کا نام ہی دشمن ہو، چند مثالیں یہاں نقل کی جاتی ہیں:

☆ ہم تیری مدد سے دولت حاصل کریں، ہم تیری اعانت سے اور آریوں کی قوت سے اپنے تمام دشمن دسیوں کو مغلوب کر کے۔ (رگ وید:۲:۱۱:۱۹)

☆ اے بہادر! ہم تیری مدد سے دونوں قسم کے دشمنوں کو قتل کر کے خوشحال ہوں۔

(رگ وید:۶:۸:۱۳)

☆ دشمنوں کے قتل کرنے والے در تیرا! دسیوں کو ہلاک کرنے والے!۔

(رگ وید:۱۰:۸۳:۳)

☆ تو ہمارے دشمنوں کو قتل کر...... قتل کیے جاؤ دشمنوں کو کچلے جاؤ۔

(رگ وید:۱۰:۸۴:۲-۳)

☆ اندر اور سورما! تو خبیث دشمن کو جلا دے۔ (اتھرو وید:۳:۴:۱-۴)

غرض کہ ہندو مذہبی کتابوں میں ان لوگوں کو جو اس مذہب کو نہ مانتے ہوں یا جن کو آریہ نسلی اعتبار سے حقیر جانتے ہوں، انہیں عام طور پر ''دشمن'' ہی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ شودروں کا بدقسمت گروہ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، اگر دوستی اور دشمنی کے پیمانے میں رکھ کر ان کے بارے میں ہندو مذہبی کتابوں کی تعلیمات کو دیکھا جائے تو حقارت کے علاوہ ان سے نفرت کا اظہار بھی ہوتا ہے، اور یہ بھی کہ اونچی ذات کے لوگوں کو ان لوگوں سے بے تعلق رہنا چاہیے اور ان سے ہرگز دوستی کا رشتہ نہیں جوڑنا چاہیے، مثلاً منو جی شودروں کے بارے میں ہدایت کرتے ہیں:

☆ وہ کسی برادری سے خارج کیے ہوئے شخص یا چنڈ کے ساتھ ایک درخت کے سایہ میں بھی نہ ٹھہرے۔ (منوسمرتی:۴:۷۹)

واضح ہو کہ چنڈ سے مراد وہ شخص ہے جو شودر مرد اور برہمن عورت کے اختلاط سے پیدا ہوا ہو۔

☆ جو کوئی شودر کو دھرم کی تعلیم دے گا اور جو اسے مذہبی مراسم ادا کرنا سکھائے گا، وہ اس شودر کے ساتھ ہی اسم ورت نامی جہنم میں جائے گا۔ (منوسمرتی:۴:۸۱)

☆ چنڈ اور سپاس لوگوں کی رہائش بستی کے باہر ہونی چاہیے۔ (منوسمرتی:۱۰:۵۱)

☆ براہمن شودر سے کبھی دان نہ لے۔ (منوسمرتی:۱۱:۲۴)

یہ محض چند مثالیں ہیں، ورنہ منوسمرتی تو ایسی تعلیمات سے پُر ہیں اور ان کو اتنا قابل اجتناب سمجھا گیا ہے کہ:

☆ اگر براہمن کسی بلی یا نیولے یا چوہے یا مینڈک یا کتے یا چھپکلی یا اُلو یا کوے کو مار ڈالے تو اس کا وہی کفارہ ہے جو شودر کو مارنے پر مقرر کیا گیا ہے۔

(منوسمرتی:۱۱:۱۳۲)

غور فرمایئے کہ نسل و مذہب کی بنیاد پر ایک طبقہ کے ساتھ کیسی نفرت وعداوت کو رَوا رکھا گیا ہے اور کس کس طرح لوگوں کو ان سے دور رہنے کی تعلیم دی گئی ہے؟؟

غیر مسلم اور ہدایت

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِيْنَ. (التوبه : ۳۷)

اللہ کافر لوگوں کو صحیح راستہ نہیں دکھاتا

یہ آیت کا صرف آخری ٹکڑا ہے، پوری آیت کا ترجمہ دیکھ لیا جائے تو خود بخود غلط فہمی دور ہو جائے گی، اللہ تعالیٰ نے پہلے یہ بات بتائی کہ زمین وآسمان کی تخلیق کے وقت سے ہی سال کے بارہ مہینے ہیں، یعنی ۱۲ مہینوں میں سورج کے گرد زمین کی گردش پوری ہوتی ہے، ان میں سے چار مہینے ''حرام'' ہیں، یہ چار مہینوں کے حرام ہونے کا حکم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے ہی عربوں میں چلا آرہا تھا، ان مہینوں کے حرام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان میں جنگ کی مکمل ممانعت ہے، عرب کے خطہ میں جہاں کوئی قانونی حکومت نہیں تھی، ان

مہینوں کا احترام لوگوں کے لیے بڑی اہمیت کا حامل تھا، کیوں کہ ان ہی مہینوں میں وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کر سکتے تھے، یہ چار مہینے تھے: رجب، ذوقعدہ، ذوالحجہ اور محرم۔

لیکن صورتِ حال یہ تھی کہ جب وہ ان مہینوں میں سے کسی مہینہ میں جنگ کے لیے مناسب موقع پاتے تو مہینے کو بدل دیتے، مثلاً کہتے کہ اس سال ذوقعدہ کی جگہ صفر ہے اور صفر کی جگہ ذوقعدہ، اسی طرح کبھی مہینہ بڑھا دیتے اور بارہ مہینوں کی جگہ تیرہ مہینوں کا سال قرار دیتے، کبھی مہینہ گھٹا کر ۱۱ مہینوں کا سال کردیتے۔ قرآن مجید نے ان کے اس رویہ پر تنقید کی اور فرمایا:

إِنَّمَا النَّسِيءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُحِلُّونَهُ عَامًا وَيُحَرِّمُونَهُ عَامًا لِّيُوَاطِئُوا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ فَيُحِلُّوا مَا حَرَّمَ اللَّهُ زُيِّنَ لَهُمْ سُوءُ أَعْمَالِهِمْ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ. (توبہ: ۳۷)

بیشک نسی (مہینوں کا اپنی جگہ سے ہٹا دینا) کفر میں زیادتی ہے، اس کے ذریعہ کفر کرنے والے گمراہ کیے جاتے ہیں، وہ کسی سال حرام مہینہ کو حلال کرلیتے ہیں اور کسی سال حرام سمجھتے ہیں، تا کہ ان مہینوں کی جنہیں اللہ نے حرام قرار دیا ہے، گنتی پوری کرلیں، پھر اللہ کے حرام کیے ہوئے مہینوں کو حلال کرلیتے ہیں، ان کی بداعمالیاں انہیں اچھی معلوم ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔"

غرض کہ اہل مکہ کے جانتے بوجھتے اس غلط روش کو اختیار کرنے کی قرآن نے مذمت کی ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ عوام کو گمراہ کیا جاتا تھا، مثلاً کسی چیز پر سالانہ سود مقرر ہوا ہے اور آپس میں مشورہ کرکے دس مہینے کا سال قرار دے دیا، تو اب دس ہی ماہ میں وہ پورا سود بیچارے بھولے بھالے عوام سے وصول کرنے کا بہانہ ہاتھ آگیا، اسی طرح کسی کو ایک سال کے لیے مزدوری پر رکھا اور اجرت سالانہ متعین کی، اب بارہ کے بجائے چودہ ماہ کا سال مقرر کرلیا اور دو مہینہ زیادہ اس سے خدمت لے لی، اس طرح پر عوام کو بے وقوف بنانے کا حیلہ تھا، اسی کو قرآن نے کہا ہے کہ کچھ کافروں ہی کو اس نام پر گمراہ کیا جاتا ہے اور دھوکہ میں ڈالا جاتا ہے،

پھر اہلِ مکہ میں سے ان مجرم پیشہ لوگوں کے بارے میں کہا گیا کہ یہ چوں کہ دانستہ طور پر غلطی پر مصر ہیں، اس لیے ان کو ہدایت حاصل نہیں ہو سکتی۔

پس یہ بات کافروں کے ایک خاص گروہ کے بارے میں ہے، ورنہ قرآن تو چاہتا ہی ہے کہ جو مسلمان نہیں ہیں وہ بھی ہدایت کے راستہ پر آئیں، اسی لیے قرآن نے اپنا تعارف ہی یہ کرایا ہے کہ وہ تمام انسانیت کے لیے ہدایت ہے "هُدًى لِّلنَّاسِ" (البقرہ ۲:) اور اس امت کو حق اور سچائی کی طرف بلانے کا حکم دیا گیا ہے، تو اگر قرآن کا یہ تصور ہوتا کہ کسی غیر مسلم کو وہ راستہ مل ہی نہیں سکتا جس کو اسلام صحیح راستہ سمجھتا ہے اور ہدایت قرار دیتا ہے، تو کیوں کرامتِ مسلمہ کو انسانیت کی دعوت کے لیے مامور کیا جاتا؟

عیسائیوں میں آپسی عداوت

فَأَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللَّهُ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ. (المائدہ:۱۴)

پھر ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لیے دشمنی اور بغض ڈال دیا ہے اور اللہ جلد انہیں بتادے گا جو کچھ کہ وہ کرتے رہے ہیں۔

یہ بھی آیت کا ایک ٹکڑا ہے، پوری آیت اس طرح ہے:

وَمِنَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَى أَخَذْنَا مِيثَاقَهُمْ فَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ فَأَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللَّهُ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ. (المائدہ:۱۴)

اور جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم نصرانی ہیں، ان سے بھی ہم نے عہد لیا تھا، جو کچھ انہیں نصیحت کی گئی، اس کا بڑا حصہ وہ بھلا بیٹھے، تو ہم نے ان میں قیامت تک کے لیے باہم بغض وعداوت پیدا کر دی اور عنقریب اللہ انہیں جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں، ان کے بارے میں بتائیں گے۔

اس آیت میں چند باتیں قابل غور ہیں:

اوّل یہ کہ یہ ارشاد ان لوگوں سے متعلق ہے جو اپنے آپ کو عیسائی کہتے ہیں، نہ کہ تمام غیر مسلموں سے متعلق، دوسرے قرآن نے ہمیں بتایا کہ ان سے حضرت عیسیٰ نے عہد لیا تھا کہ آپ کے بعد جو نبی آئے گا، یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، وہ ان پر ایمان لائیں گے، لیکن انہوں نے اس عہد کو پس پشت ڈال دیا، حالانکہ عیسائیوں نے اور خاص کر سینٹ پال نے عیسائی عقائد کو پوری طرح ردّ و بدل کر کے رکھ دیا ہے اور اس میں اپنی طرف سے آمیزشیں کر دی ہیں، لیکن اس کے باوجود انجیل میں ابھی بھی محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی طرف اشارے موجود ہیں، یہاں صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دو ارشادات نقل کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

- اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو گے اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے۔ (یوحنا: ۱۴:۱۶)
- میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے، کیوں کہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا، لیکن اگر میں جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راست بازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا۔'' (یوحنا: ۱۶: ۷، ۸)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی نبوت کا دعویٰ فرمایا، قرآن نے آپ کو ''خاتم النبیین'' یعنی ابد تک کی نبوت کا حامل قرار دیا اور آپؐ نے دنیا پر واضح کیا کہ حضرت عیسیٰ اور ان کے معاندین میں کون راست باز ہے اور گنہ گار؟ اس طرح عیسائیوں کے لیے حضرت عیسیٰ اور انجیل کی تعلیم کے مطابق آپؐ پر ایمان لانا ضروری تھا، لیکن انہوں نے ایمان نہ لا کر اس عہد کی خلاف ورزی کی۔

تیسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت کے علاوہ دنیا میں بھی قوموں پر ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے بعض عذاب نازل کرتے ہیں، جن میں سے ایک ان کے درمیان باہمی اختلاف و افتراق کا پیدا ہو جانا بھی ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت

مسلمہ کے بارے میں بھی فرمایا کہ اس امت پر کوئی اجتماعی عذاب تو نازل نہیں ہوگا، لیکن آپسی اختلاف وافتراق کا عذاب ان کی شامتِ اعمال کی وجہ سے نازل ہوگا اور مسلمان عملاً آج اس سے گذر رہے ہیں، پس اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں کے بارے میں فرمایا کہ قیامت تک عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے درمیان سخت اختلاف کی کیفیت باقی رہے گی اور یہ ایک حقیقت ہے کہ عیسائیوں میں جتنے زیادہ مذہبی فرقے ہیں، شاید ہی کسی اور مذہب میں ہوں اور مذہبی اختلاف کی بنیاد پر عیسائی فرقوں نے ایک دوسرے کو جس طرح بے تحاشا قتل اور زندہ جلا دینے کی سزا دی ہے، مشکل سے مذاہب کی تاریخ میں اس کی کوئی اور مثال ملے گی، کلیسائی نظام کے زمانہ عروج میں مذہبی عدالتوں کے حکم پر قتل کیے جانے والوں کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ بتائی جاتی ہے، جن میں تین لاکھ چالیس ہزار کا تعلق صرف اسپین سے تھا اور ان میں بتیس ہزار وہ لوگ ہیں جو زندہ جلا دیے گئے، پھر عیسائی حکومتوں کی باہمی منافرت دیکھیے کہ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم دراصل ان ہی کی باہمی رقابتوں کے نتیجہ میں ہوئیں، جن میں کروڑوں انسان لقمہ اجل بن گئے ۔ یہ قرآن کی ایک پیشین گوئی ہے اور ایسی پیشین گوئی ہے جو انسانیت کے مشاہدہ میں ہے، اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو قابل اعتراض، یا مسلمانوں کو کسی فرقہ کے خلاف بھڑکانے والی ہو۔

اس پمفلٹ میں چھ آیتیں وہ ذکر کی گئی ہیں جن میں کفر کرنے والوں کے لیے آخرت کی سزاؤں کا ذکر ہے۔ یہ آیات اس طرح ہیں:

غیر مسلم اور عذابِ آخرت

> إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا. (النساء: ٥٦)
>
> بے شک جن لوگوں نے ہمارے احکام کا انکار کیا، ہم انہیں دوزخ میں داخل کریں گے، جب جب ان کی کھالیں پک جائیں گی تو ہم انہیں دوسری

کھالوں سے بدل دیں گے، تا کہ وہ عذاب چکھتے رہیں، بیشک اللہ طاقت والا حکمت والا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنَافِقِيْنَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِيْنَ فِيْهَا هِيَ حَسْبُهُمْ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ. (توبہ:۶۸)

منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کافروں سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ہمیشہ جہنم کی آگ میں رہیں گے، یہی انہیں بس ہے اور ان پر اللہ نے لعنت کی ہے اور ان کے لیے ہمیشہ رہنے والا عذاب ہے۔

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وَارِدُوْنَ (الانبیاء:۹۸)

یقیناً تم اور اللہ کے سوا جنہیں تم پوجتے ہو، وہ دوزخ کا ایندھن ہیں اور تم لوگ اس میں اترو گے۔

فَلَنُذِيْقَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَذَابًا شَدِيْدًا وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ. (حم السجدۃ:۲۷)

تو یقیناً ہم کفر کرنے والوں کو سخت عذاب چکھائیں گے اور ان کو ان کے برے کاموں کا بدلہ دیں گے۔

اس سے پہلے کی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات ان لوگوں کے بارے میں فرمائی ہے جو قرآن مجید پڑھنے کے وقت شور وغل کرتے تھے اور لوگوں کو قرآن سننے نہیں دیتے تھے۔

ذٰلِكَ جَزَآءُ اَعْدَآءِ اللّٰهِ النَّارُ لَهُمْ فِيْهَا دَارُ الْخُلْدِ جَزَاءً بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ. (حم السجدۃ:۲۸)

یہ بدلہ ہے اللہ کے دشمنوں کا، آگ، اسی میں ان کا ہمیشہ کا گھر ہے، اس کے بدلہ میں کہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيَاتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا اِنَّا مِنَ

الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ. (السجدۃ:۲۲)

اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جسے اس کے رب کی آیات کے ذریعہ یاددہانی کرائی جائے، پھر بھی وہ اس سے منہ پھیر لے، یقیناً ہم ایسے مجرموں سے بدلہ لیں گے۔

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنے والوں، اس کے احکام کی نافرمانی کرنے والوں اور غیر اللہ کے سامنے سر جھکانے والوں کے لیے عذاب کا ذکر ہے، یہ بات وی ایچ پی کے بھائیوں کو بہت ناگوارِ خاطر ہے۔ دنیا کی معمولی حکومتیں بھی اپنے مخالفین کو سزائیں دیتی ہیں، وی، ایچ، پی اور بجرنگ دل والے بہت سے بے قصور لوگوں کو صرف اس لیے تکلیفیں دینا، زندہ جلانا اور نیست و نابود کر دینا درست سمجھتے ہیں، کہ وہ ان کے ہم مذہب نہیں ہیں لیکن وہ چاہتے ہیں کہ خدا اتنا عاجز، بے حس اور بے شعور ہو کہ چاہے کوئی اس کا فرماں بردار ہو یا نافرمان، کوئی اس کے سامنے سر جھکائے یا اس کو برا بھلا کہے، کوئی اس کے حق میں دوسرے کو شریک ٹھہرائے، لیکن خدا کوئی حرکت نہ کرے، وہ اپنی آنکھیں اور کان بند کیے رہے اور ظلم و بدی کرنے والوں کو نہ دنیا میں کچھ کہے اور نہ مرنے کے بعد، یہ کیسی نامعقول اور ناانصافی کی بات ہے؟ خدا کی تو شان ہی یہی ہے کہ وہ پورا پورا انصاف کرے اور اچھے اور بروں کو ان کے عمل کی جزا و سزا دے، دنیا کے تمام ہی مذاہب میں جزا و سزا کے قانون کو مانا گیا ہے اور اس بات کی تلقین کی گئی ہے کہ انسان کو اچھے عمل کرنے چاہئیں، تاکہ وہ خدا کے عذاب سے بچ سکے، ہندو مذہب میں بعض اعمال پر سورگ اور بعض اعمال پر نرک کی جو پیشین گوئی ہے وہ آخر کیا ہے؟ یہ جو شری کرشن جی ارجن کو ترغیب دیتے ہیں کہ تم کوروں پر حملہ کرو، اس سے تمہارے لیے سورگ کا دروازہ کھل جائے گا۔ اور منوجی کہتے ہیں کہ برہمن شودر کی لڑکی کو اپنے پلنگ پر بھی بٹھالے تو بیچارہ نرک میں چلا جائے گا۔ یہ سورگ اور نرگ کیا ثواب و عذاب سے عبارت نہیں ہے؟ ہندو مذہبی علماء آج جس پنر جنم کے قائل ہیں، اس کے مطابق ایک انسان اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے آئندہ کتا اور سور بن سکتا ہے، یہ بھی دھرم کی خلاف ورزی پر خدا کی طرف سے عذاب ہی تو ہے! اس

لیے ان آیات پر اعتراض کے کوئی معنی نہیں، بلکہ اگر خدا نافرمانوں کی گرفت نہیں کرتا، تو یہ خدا کی شان اور انصاف کے خلاف بات ہوتی، اگر نافرمانوں کے لیے کوئی سزا نہ ہوتی تو وید میں یہ دعا سکھائی نہ جاتی کہ وید مخالفوں کو ہلاک کر دے۔ (اتھر وید: ۲۰:۱۰۵:۱)

ہاں! اگر ان آیات میں اسلام کی مخالفت کرنے والوں کے خلاف مسلمانوں کو اکسایا گیا ہوتا کہ وہ خدا کی عدالت کا انتظار نہ کریں، بلکہ خود ہی انہیں سزائیں دے دیں، تو اس سے اشکال پیدا ہوسکتا تھا، لیکن قرآن نے یہ اصول بتایا کہ دنیا میں ہر شخص اپنی سوچ کے مطابق عمل کرے گا، مسلمان دوسری قوموں پر داروغہ نہیں، کہ وہ انہیں اپنی رائے پر عمل کرنے کے لیے مجبور کریں، لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (الغاشیہ: ۲۲) لیکن اللہ تعالیٰ آخرت میں مسلمان ہوں یا غیر مسلم، انہیں خود ان کی بداعمالیوں کی سزا دے گا، قرآن نے بار بار دوزخ میں آگ کی سزا کا ذکر کیا ہے، لیکن دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ ایک انسان دوسرے انسان کو آگ میں جلانے کی سزا دے اور فرمایا کہ ایسی سزا دینے کا حق صرف اللہ ہی کو ہے، غرض کہ دنیا کا قانون اور ہے اور آخرت کا قانون اور، اور اگر اللہ آخرت میں بھی ظالم و مظلوم اور فرماں بردار و نافرمان کا فرق نہ کرے تو پھر وہ خدا کہلانے کا مستحق بھی ہے؟

☆☆☆

اسلام ـــــ صلح و آشتی کا مذہب

قارئین جب اس تحریر کو پڑھیں گے تو جناب جنرل پرویز مشرف ہندوستان سے واپس ہو چکے ہوں گے، پرویز صاحب پڑوسی ملک کے خود ساختہ صدر ہیں، اور خیال کیا جاتا ہے کہ ہندوستان پر کارگل جنگ تھوپنے کے پس پردہ اصل شخصیت انہی کی ہے، لیکن اس وقت وہ صلح و امن کے نقیب بن کر آئے ہیں، اور انہوں نے متضاد قسم کی باتیں کہی ہیں، پاکستان کے اٹل موقف کو دہرایا بھی ہے، اور لچکدار رویہ اختیار کرنے کی بات بھی کہی ہے، یہ بات خوش آئند ہے کہ ہمارے ملک نے ایک حد تک ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر ان کا گرم جوش خیر مقدم کیا ہے، اور ایک میزبان کی حیثیت سے اپنے مہمان کے اعزاز و اکرام کا پورا پورا خیال رکھا ہے، اب وقت ہی بتائے گا کہ یہ ملاقات کس حد تک نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے، اور دونوں ملکوں کو امن کی نعمت نصیب ہو پاتی ہے؟ اتنی بات تو ظاہر ہے کہ ہند و پاک اور فی الحال دو حصوں میں بٹا ہوا کشمیر ہر جگہ لوگ امن کے پیاسے ہیں، اور دعاء کر رہے ہیں کہ ان ملکوں کے درمیان صلح و صفائی کی صورت نکل آئے، تاکہ بچھڑے ہوئے رشتہ داروں کا ایک دوسرے سے ملنا آسان ہو سکے، اور ملک کے کثیر معاشی مسائل جو بے معنی جنگ و جدال پر خرچ ہو رہے ہیں، غربت دور کرنے اور عوامی فلاح و بہبود کے کاموں پر خرچ ہوں، اگر ایسا ہو جائے تو یقیناً یہ اس خطہ کی بہت بڑی خوش نصیبی ہوگی، یہ دونوں ممالک اپنے وسائل کو اپنے عوام کی فلاح کے لئے خرچ کر سکیں گے، اور مغربی ممالک کی محکومیت اور غلامی سے بھی انہیں نجات حاصل ہوگی۔

افسوس کہ بعض فرقہ پرست اور امن دشمن عناصر ان مواقع پر امن اور صلح کو قوت پہونچانے کی بجائے ان کو غیر حقیقت پسندانہ اور خلاف واقعہ پروپیگنڈہ کے لئے استعمال

کرتے ہیں، چنانچہ اس وقت بھی یہ غلط تاثر پیدا کیا جارہا ہے کہ اسلام ایک دہشت گرد اور کٹر پسند مذہب ہے، جو دوسری قوموں کے ساتھ صلح، میل جول اور بقاء باہم کے اصول پر اتحاد کے لئے تیار نہیں ہوتا، اس لئے اسلام میں غیر مسلموں کے ساتھ صلح کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی ہے، اور مسلمان اپنے قومی مزاج کے اعتبار سے ہی شدت پسند ہیں، حالاں کہ یہ بات قطعاً خلافِ واقعہ اور نادرست ہے۔

اسلام ''سلم'' سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہی صلح کے ہیں، قرآن نے بار بار صلح وآشتی کو اختیار کرنے کی تاکید کی ہے، اور صلح کے بعد پوری مضبوطی کے ساتھ اس پر قائم رہنے کا حکم دیا ہے، قرآن نے غیر مسلموں کے بارے میں فرمایا:

> اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی صلح کے لئے جھک جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو، بیشک اللہ تعالیٰ سننے والے اور جاننے والے ہیں، اور اگر وہ تجھے دھوکہ دینا چاہیں تو تجھ کو اللہ کافی ہے، اللہ ہی نے تجھ کو اپنی مدد کے ذریعہ اور مسلمان کے ذریعہ طاقت پہونچائی ہے۔ (انفعال: ۶۱، ۶۲)

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ جو لوگ صلح کرنا چاہیں، اور امن وآشتی کے خواہاں ہوں، مسلمانوں پر یہ بات واجب ہے کہ وہ ان کی طرف صلح وآشتی کا ہاتھ بڑھائیں، بلکہ اس آیت میں اس جانب بھی اشارہ ہے کہ اگر صلح میں فریقِ مخالف کی طرف سے اندیشے اور خدشات ہوں تب بھی ممکن حد تک صلح کی راہ اختیار کرنی چاہئے، اور اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔

جو غیر مسلم قومیں مسلمانوں پر حملہ کرنے سے باز رہیں، اور صلح وامن کے رویے پر قائم ہوں، ان سے جہاد جائز نہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

> اگر وہ تم سے کنارہ کش ہوں، چنانچہ تم سے جنگ نہ کریں، اور صلح کی پیشکش کریں تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ان پر دست درازی کی کوئی گنجائش نہیں رکھی۔ (النساء: ۹۰)

یہاں تک کہ اگر کسی غیر مسلم قوم سے مسلمانوں کا معاہدہ ہو، اور وہاں مسلمان شہریوں

کے ساتھ کوئی زیادتی ہوتی ہو، تو اخلاقی اور سیاسی طور پر تو ضرور اس کے سدِ باب کی کوشش کرنی چاہئے، لیکن قرآن کہتا ہے کہ مسلمان حکومت کو ان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا حق نہیں، چنانچہ قرآن کا بیان ہے :

> جو لوگ ایمان لائے اور (مسلم ملک کو) ہجرت نہیں کی تمہارا ان سے کوئی تعلق نہیں، یہاں تک کہ وہ ہجرت کر کے آجائیں، اور اگر وہ تم سے دین کے بارے میں مدد طلب کریں، تو تم پر مدد کرنا لازم ہے، مگر کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں، جن کے اور تمہارے درمیان معاہدہ ہو، اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ انہیں دیکھ رہا ہے۔ (الانفعال:۷۲)

اسلام نہ صرف مسلمانوں کو صلح کا حکم دیتا ہے، بلکہ خیر امت کی حیثیت سے مسلمانوں کو اس امر کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان حسب ضرورت مصالحت کنندہ کا کردار ادا کریں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اکثر سرگوشیوں میں خیر نہیں، سوائے اس کے کہ صدقہ کا حکم دیا جائے یا بھلائی کا، یا لوگوں کے درمیان صلح کرائی جائے، (النساء:۱۱۴) اللہ تعالیٰ نے اس بات سے بھی منع فرمایا کہ کوئی شخص لوگوں کے درمیان صلح نہ کرانے کی قسم کھالے، (البقرۃ:۲۲۴) صلح بہرحال خیر کی چیز ہے، خواہ افراد کے درمیان ہو یا قوموں کے درمیان: اَلصُّلْحُ خَيْرٌ (النساء:۱۲۸) اور کیوں نہ ہو، کہ اسلام زمین میں قتل و خوں ریزی کو ناپسند کرتا ہے: لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (الاعراف:۵۶) بلکہ اگر کسی ملک یا قوم کے ساتھ تعلقات اچھے نہ ہوں، اس وقت بھی ان کے ساتھ بہتر رویہ رکھنا چاہئے، اس لئے کہ ممکن ہے کہ آج کے دشمن کل کے دوست ہو جائیں، (الممتحنۃ:۷) جیسے قرآن مجید میں بار بار صلح و آشتی کی تعلیم دی گئی ہے، اور بے سبب جنگ و جدال کو منع فرمایا گیا ہے، اسی طرح حدیث میں بھی صلح کرنے اور کرانے کی بڑی ترغیبات منقول ہیں، حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: اے ابوایوب! کیا میں تجھے ایسا صدقہ نہ بتاؤں، جسے اللہ اور اس کے رسول پسند فرماتے ہیں؟ اور وہ یہ ہے کہ جب لوگوں میں باہم بغض و فساد پیدا ہو جائے تو تم ان کے درمیان صلح کراؤ (مجمع الزوائد:۸/۷۹)

رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ہمسایہ قوموں کے ساتھ امن وآشتی اور صلح وامان کی واضح مثالیں موجود ہیں، آپ ﷺ نبوت سے پہلے حلف الفضول میں شریک ہوئے، جس کا مقصد مظلوموں کی بلا امتیاز نسل وقوم مدد کرنا تھا، آپ ﷺ نبوت کے بعد بھی فرمایا کرتے تھے کہ اگر آج بھی کوئی مجھے اس کی طرف دعوت دے تو میں اسے قبول کروں گا۔

جب آپ مدینہ تشریف لئے گئے تو مدینہ میں بسنے والی تمام مذہبی اور نسلی اکائیوں کے درمیان باہمی امن، مذہبی آزادی، ایک دوسرے کے احترام اور مدینہ کی مشترک مدافعت کے سلسلہ میں تحریری معاہدہ فرمایا، اور اس پر تمام فریقوں کا دستخط لیا گیا، اس سلسلہ میں صلح حدیبیہ کا واقعہ تو سیرت کا ایک اہم عنوان ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ نے مشرکین مکہ سے دس سال کے لئے ناجنگ معاہدہ کیا، اور اہلِ مکہ کی شرطوں پر کیا، اور جب تک خود اہلِ مکہ کی طرف سے کھلی ہوئی بدعہدی پیش نہ آگئی، آپ اس معاہدہ پر قائم وثابت قدم رہے۔

پھر جو معاہدہ ہو جائے اس پر قائم رہنا بھی شرعاً واجب ہے، یہ بات کہ ایک طرف صلح کی میز پر بیٹھیں، اور دوسری طرف اسی فریق کے خلاف اندرونی ریشہ دوانیاں بھی جاری رکھیں، کسی طرح درست نہیں، قرآن نے عہد وپیمان کی پابندی پر بہت زور دیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ عہد کو پورا کرو، یقیناً عہد کے بارے میں سوال ہوگا: وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ، اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا، (بنی اسرائیل:۳۴) اہلِ ایمان کی علامت بتائی گئی ہے کہ وہ امانتوں اور عہد وپیمان کی نگہداشت کرتے ہیں، (مومنون:۸) رسول اللہ ﷺ نے اسے نفاق قرار دیا ہے کہ آدمی عہد کے بعد اس کی خلاف ورزی کرے: اذا عاهد غدر، اللہ تعالیٰ کا ارشاد گذر چکا ہے کہ اگر کسی ایسی حکومت کی جانب سے اس کے مسلمان شہریوں پر زیادتی ہو، جن سے صلح ہو چکی ہے، تو وہاں مسلمانوں کو اپنا ہاتھ روکے رکھنا ہوگا۔

خود رسول اللہ ﷺ نے اس کو برت کر دکھایا ہے، صلح حدیبیہ کے فوراً بعد حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ کو اس دفعہ سے مستثنیٰ کر دیا جائے، لیکن اہلِ مکہ تیار نہیں ہوئے، چنانچہ آپ ﷺ نے ملال خاطر کے ساتھ انہیں واپس فرمایا، اور ارشاد فرمایا کہ ہم ان سے معاہدہ کر چکے

ہیں، جیسا کہ تمہیں معلوم ہے، اور ہمارے دین میں معاہدہ میں خلاف ورزی کی گنجائش نہیں: **و لا یصلح لنا فی دیننا الغدر**، (سیرت ابن ہشام: ۳۷۴/۲) اسی طرح حضرت ابو بصیر رضی اللہ عنہ جب مکہ سے مدینہ آ گئے تو آپ ﷺ نے انہیں بھی واپس فرما دیا، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عہد کی پابندی اسلام کی نظر میں کس قدر اہم اور ضروری ہے، بین قومی معاہدات کی خلاف ورزی کے بارے میں حضرت عبد اللہ بن عباس نے فرمایا کہ جب کوئی قوم بدعہدی کرتی ہے تو اللہ ان پر دشمنوں کو مسلط فرما دیتے ہیں: **ما غدر قوم بالعھد الاسلط اللہ علیھم العدو** (موطا امام مالک، باب ما جاء فی الوفاء بالامان)

اس لئے حقیقت یہ ہے کہ اسلام امن و آشتی، صلح و سلامتی اور انسانی اخوت و بھائی چارگی کا مذہب ہے، جو نہ صرف صلح کو پسند کرتا ہے، بلکہ چاہتا ہے کہ مسلمان صلح میں پیش قدمی کریں، اور حسب موقع ضرورت پڑے تو اس کے لئے اپنے جذبات و مفادات کی ایک گونہ قربانی بھی دیں، اور نہ صرف خود صلح کریں، بلکہ دوسری قوموں کے درمیان بھی صلح کے نقیب اور نمائندہ بن کر سامنے آئیں، اور جن شرطوں پر صلح ہو، ان کے پابند و پاس دار رہیں!

(۲۰ ؍ جولائی ۲۰۰۱ء)

اسلام کا تصوّر جہاد

عام طور پر سب سے زیادہ جو مسئلہ غیر مسلموں کے تئیں اسلام کے رویہ کے بارے میں لوگوں کو کھٹکتا ہے اور بڑے زور و شور کے ساتھ اس کا نام لے کر اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے، وہ ہے اسلام کا تصور جہاد!۔۔۔ آج کے میڈیا اور ذرائع ابلاغ نے جہاد کو دہشت گردی اور لوٹ و غارت گری کے ہم معنی بنا دیا ہے، لیکن حقیقت اس کے بر عکس ہے، جہاد ظلم نہیں، بلکہ ظلم کو روکنے کی کوشش ہے، یہ ظالموں کے ہاتھ سے تلوار چھین لینے کی جدوجہد کا نام ہے، اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا (حج:۳۹) جہاد کا مقصد ملک گیری و کشور کشائی اور دوسری قوموں کو مغلوب اور ذلیل کرنا نہیں ہے، بلکہ اللہ کے دین کو غالب کرنا اور اس کی حفاظت کرنا ہے، اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ (نساء:۷۶)

حقیقت یہ ہے کہ جہاں اخلاق کی تلوار اور پند و موعظت کا ہتھیار نہیں چلتا، وہاں جنگ ضروری ہو جاتی ہے، اہنسا اور عدم تشدد کا فلسفہ ہر جگہ کارگر نہیں ہوتا، ہمارے ملک میں مختلف ریاستوں میں اس وقت علاحدگی پسندی کا رجحان بڑھ رہا ہے، مختلف پڑوسی ملکوں سے بھی ہماری سرحدوں کو خطرات ہیں، کیا ان حالات میں ملک کا کوئی بہی خواہ اور محب وطن شہری اس بات کی اجازت دے سکتا ہے کہ ملک اپنی دفاعی تیاریوں کو نظر انداز کر دے اور دشمنوں کے حملے سے نمٹنے کے لئے خود کو تیار نہیں رکھے؟

غور کیا جائے کہ کیا دنیا میں کوئی ایسا مذہب بھی گذرا ہے جس نے جنگ کو بالکل ممنوع قرار دیا ہو، یہودیوں کے یہاں جنگ کا بہت بے رحمانہ تصوّر ملتا ہے، بائبل میں ہے،

''جب تم یردن سے پار ہو کر زمین کنعان میں داخل ہو تو ان

سب کو جو اس زمین کے باشندے ہیں، اپنے سامنے بھگادو، اور ان کی مورتیں فنا کردو، اور ان کے ڈھالے ہوئے بتوں کو توڑ دو، اور ان کے سب اونچے مکانوں کو ڈھادو، اور ان کو جو اس زمین کے بسنے والے ہیں۔خارج کردو، اور وہاں آبسو، (استثناء: ۳۳:۵۰،۵۴)

بائبل نے جنگی اعتبار سے غیر اسرائیلیوں کو دو حصہ میں تقسیم کیا ہے، ایک وہ علاقہ جن کو یہودی عقیدہ کے مطابق خدا نے اسرائیل کی میراث میں دیا ہوا ہے، اس علاقہ کا جنگی قانون یہ ہے کہ مردوں اور شادی شدہ عورتوں کو قتل کردیا جائے، صرف کنواری لڑکیوں کو چھوڑ کر اپنے تصرف میں لے لیا جائے، اور دوسرا علاقہ وہ ہے جو نبی اسرائیل کی میراث میں نہیں ہے، یہاں مردوں، عورتوں اور بچوں یہاں تک کہ ان کے جانوروں کو بھی تہہ تیغ کردیا جائے۔

عیسائی حضرات خیال کرتے ہیں کہ ان کا مذہب جنگ و جدال کا مذہب نہیں ہے، گو آج پوری دنیا میں عیسائی اقوام ہی تباہ کاریوں اور ہلاکت خیزیوں کی اصل ذمہ دار ہیں، لیکن مذہبی اعتبار سے بھی عیسائی حضرات یہ کیوں کر کہہ سکتے ہیں؟ جب کہ انجیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کا ارشاد ہے:

"یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا، صلح کرانے نہیں، بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں،" (متی: ۱۰:۳۴،۳۶)

ایک موقع پر حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے متبعین کو یہ نصیحت بھی فرمائی کہ وہ اپنی پوشاک بیچ کر تلوار خریدیں (لوقا: ۲۲:۳۶)

ہندو مذہب اپنے آپ کو اہنسا اور عدم تشدد کا مذہب کہتا ہے، گاندھی جی کا خیال ہے کہ ہندو مذہب کا سب سے بڑا حسن یہی ہے، لیکن ہندو مذہب کی تاریخ جنگوں سے پُر ہے، رامائن، شری رام جی کے حالات اور رام اور راون کی بھیانک جنگ کی کہانی ہے، گیتا جس کو ہندو بھائیوں کے یہاں بڑا تقدس حاصل ہے، اور جس کو خود گاندھی جی اپنی ماں کہا کرتے تھے، وہ تمام تر کوروؤں اور پانڈوؤں کی داستانِ جنگ ہے، ہندوؤں کے عقائد

میں ایک آواگمن بھی ہے، جس کے تحت ایک شخص موت کے بعد دوبارہ جنم لیتا ہے، اس کے پیشِ نظر شری کرشن جی ارجن سے کہتے ہیں کہ روح کے لئے جسم کی حیثیت کپڑے کی ہے، گویا قتل انسانی پرانا کپڑا اپھاڑ کر نیا کپڑا پہنانے کے مترادف ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ کوئی بُری بات نہیں، شری کرشن جی مزید کہتے ہیں کہ جب ہر انسان کو ایک دن مرنا ہی ہے تو آخر اسے مارڈالنے میں کیا قباحت ہے؟ ظاہر ہے ان تعلیمات کی روشنی میں یہ دعویٰ کیوں کر درست ہوسکتا ہے کہ ہندو مذہب میں جنگ کا تصور نہیں ہے۔

اسلام نے بھی یقیناً جہاد کرنے کا حکم دیا ہے، لیکن اس کا یہ منشا ہرگز نہیں کہ جو بھی غیر مسلم سامنے نظر آئے اس کی گردن ماردیں، بلکہ قرآن وحدیث کے ارشادات کی روشنی میں فقہاء نے غیر مسلموں کو تین طبقوں میں تقسیم کیا ہے: ذمّی، معاہد اور حربی۔

مسلم ملک کے غیر مسلم شہریوں کو ''ذمّی'' کہتے ہیں، بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ ذمّی کہنے میں ان کی تحقیر وتذلیل ہے۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے، ذمہ کے معنی عربی زبان میں ''عہد'' کے ہیں، اور ذمّی وہ ہے جس سے مسلمانوں کا عہد ہو کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ پُرامن طریقہ پر رہیں گے، اور ایک دوسرے کے حقوق کی رعایت بھی کریں گے، گویا ان کو ذمّی کہہ کر مسلمانوں کو ان کے تئیں ذمہ داریوں کو یاد دلانا مقصود ہے کہ وہ ان کی حفاظت اور حقوق کا پورا پورا خیال رکھیں، ذمّی کی جان ومال، عزت وآبرو اور عام انسانی حقوق وہی ہیں جو مسلمانوں کے ہیں۔

غیر مسلموں کی دوسری قسم وہ ہے جن کو ''معاہدین'' کہا جاتا ہے، یعنی وہ غیر مسلم جو کسی غیر مسلم ملک کے شہری ہوں اور اس ملک سے مسلمانوں کا امن اور بقاء باہم کا معاہد ہو، یہ معاہدین بھی ذمّی ہی کے حکم میں ہیں، ان کی جان ومال اور عزت وآبرو کا احترام اسی طرح واجب ہے جیسے مسلمانوں کی جان ومال اور عزت وآبرو کا، اور یہ بھی جائز نہیں کہ ان سے طے شدہ معاہدہ کی خلاف ورزی کی جائے۔

غیر مسلموں کی تیسری قسم وہ ہے جن کو ''حربی'' کہا جاتا ہے یعنی وہ غیر مسلم جو کسی غیر مسلم ملک کے شہری ہوں اور اس ملک سے مسلمانوں کا امن اور بقاء باہم کا معاہدہ نہ ہو،

اور وہ مسلمانوں کے برسر پیکار رہتے ہوں، جو اسلام اور انسانیت کے لئے غارت گر بنے ہوئے ہوں، اسلام صرف ایسے ہی لوگوں کے خلاف تلوار اٹھانے کی اجازت دیتا ہے، لیکن اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے غالباً سب سے پہلے جنگ کے مہذب اور شائستہ قوانین دیئے، اور آپ ﷺ نے اپنے فوجیوں کو نہایت اہمیت کے ساتھ ان اصولوں کا پابند رہنے کی تاکید فرمائی، آپ ﷺ نے فرمایا: چرچ اور مذہبی عبادت گاہوں کے متعلقین کو قتل نہ کیا جائے، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو جنگ کے درمیان نشانہ نہ بنایا جائے، آپ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ مقتولین کا ''مُثلہ'' کیا جائے، اور ان کے اعضاء کاٹ دیئے جائیں، اس سے بھی منع فرمایا کہ کسی کو باندھ کر اسے نشانہ بنایا جائے، کسی کو نذرِ آتش کر دیا جائے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ سوائے خدا کے کسی کو آگ میں جلانے کا حق نہیں ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں شدید ضرورت کے بغیر آتشیں اور نیوکلیر ہتھیاروں کا استعمال درست نہیں، کیوں کہ یہ آتشیں ہتھیار ہیں، اور اس کی زد میں فوجیوں کے ساتھ وہ پُر امن شہری بھی آجاتے ہیں، جو جنگ میں شریک نہیں ہیں۔ جنگ کے موقع پر لوٹ مار اور چھینا جھپٹی ایک عام بات ہے، لیکن آپ ﷺ نے اس کو بھی منع فرمایا، آپ ﷺ نے فوجیوں کے لئے چلنے پھرنے کے بھی آداب بتائے، شور و ہنگامہ کو منع کیا، اس طرح چلنے اور منزل پر پڑاؤ ڈالنے کی تلقین کی کہ مسافر دقت محسوس نہ کریں، راہ گیروں کو نقصان پہنچانے اور ڈرانے دھمکانے سے سختی سے منع فرمایا، آپ ﷺ نے سفارتی آداب کی بھی پوری پوری رعایت فرمائی، مسیلمہ کذاب کا قاصد عبادہ بن حارث حاضر خدمت ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم سفیر نہ ہوتے تو میں تمہیں قتل کر دیتا۔ واقعہ ہے کہ دنیا کو سب سے پہلے جنگ کے درمیان تہذیب و شائستگی، انسانی احترام اور احترامِ آدمیت کا سبق نبی عربی ﷺ نے دیا، اور یہ جو کچھ آج مشرق و مغرب میں قانونِ جنگ کا شور ہے، اور جس کی سب سے زیادہ خلاف ورزی خود ترقی یافتہ قوموں کے ذریعہ ہوا کرتی ہے، یہ سب آپ ﷺ ہی کی مبارک تعلیمات کی بازگشت ہے۔

یہ تو وہ احکامِ جنگ ہیں جو عین جنگ کے درمیان اپنے دشمنوں کے ساتھ برتنے

کے ہیں، لیکن اگر اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو فتح مند کرے تو آپ ﷺ نے دشمنوں کے ساتھ نہایت فراخدلانہ سلوک کی تعلیم دی، اور عفو درگذر کا راستہ اختیار کرنے کو فرمایا، اس سلسلہ میں فتح مکہ کا واقعہ اپنی مثال آپ ہے، اہلِ مکہ نے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں پر کیا کچھ مظالم نہیں ڈھائے؟ لیکن جب اللہ نے مسلمانوں کو فتح و سر بلندی سے نوازا اور اہلِ مکہ کو ہزیمت ہوئی، تو آپ نے انتقام لینے کے بجائے عام معافی کا اعلان کر دیا، ارشاد ہوا: **لا تثریب علیکم الیوم**، آپ ﷺ نے عفو درگذر ہی پر اکتفا نہیں کیا؛ بلکہ آگے بڑھ کر ان کی عزتِ نفس اور تکریم کا بھی خیال رکھا، سردار قریش ابوسفیان کے بارے میں فرمایا. جو ان کے گھر میں پناہ لے لے وہ مامون ہے، **من دخل دار أبی سفیان فھو امن**۔

غزوۂ بدر میں ستر قیدی بنائے گئے، تو آپ ﷺ نے ان کو اس شان و اعزاز کے ساتھ رخصت فرمایا کہ ان کے لئے جوڑے بھی سلائے، آپ ﷺ نے ان قیدیوں کو صحابہ پر تقسیم فرمادیا تھا، اور صحابہ کا حال یہ تھا کہ خود بھوکے رہ کر ان کو کھلاتے، اور کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہونے دیتے، غزوۂ حنین کے موقع پر چھ ہزار دشمنوں کو گرفتار کیا گیا، لیکن آپ ﷺ نے بغیر کچھ لئے ہوئے ان سب کو رہا کر دیا — غور کیجئے! ایک طرف پیغمبر اسلام ﷺ کا یہ حسن سلوک اور انسانیت پروری ہے، دوسری طرف یورپ کی شرافت اور انسانیت دوستی کا حال یہ ہے کہ نپولین نے چار ہزار ترک قیدیوں کو محض اس لئے قتل کر دیا کہ وہ ان کے کھانے پینے کے سامان کو ایک بوجھ تصور کرتا تھا،

اسلام کے تصورِ جہاد کے پس منظر میں اس بات کا ذکر مناسب ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوات اور جہاد کے ذریعہ جو عظیم الشان انقلاب برپا کیا، اس میں کس قدر کم جانی نقصان ہوا، آپ ﷺ کے کل غزوات و سرایا کی تعداد بیاسی ہے، جن میں مسلمان شہداء کی تعداد دو سو انسٹھ اور غیر مسلم مہلوکین کی تعداد سات سو انسٹھ ہے، اس طرح کل مہلوکین دس سو اٹھارہ ہیں، گویا فی جنگ مقتولین کا اوسط ۱۱ سے کچھ زیادہ ہے۔

اب آپ اس کا تقابل ان انسانی ہلاکتوں سے کیجئے جو دوسری قوموں میں پیش آئی ہیں، ہندو تاریخ کے مطابق صرف مہابھارت کی جنگ میں لاکھوں لوگ کام آگئے، عیسائی

دنیا میں کلیسائی نظام کے زمانۂ عروج میں مذہبی عدالتوں کے حکم پر قتل کئے جانے والوں کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ بتائی جاتی ہے، ان میں ۳۲ ر ہزار وہ بدقسمت ہیں جو زندہ جلا دیئے گئے، بیت المقدس پر جب عیسائیوں کا قبضہ ہوا تو بلا امتیاز مرد و زن، بچے بوڑھے ستر ہزار مسلمان شہید کر دیئے گئے، لیکن پھر اسی بیت المقدس پر جب دوبارہ مسلمانوں کا قبضہ ہوا تو سلطان عادل صلاح الدین ایوبی نے عفو عام کا اعلان کر دیا، اور عیسائی چونکہ یہودیوں کے ساتھ رہنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اس لئے دونوں کی آبادیاں بھی الگ کر دی گئیں، پہلی جنگِ عظیم کے مہلوکین کی تعداد محتاط اندازہ کے مطابق ۷۴ رلاکھ کے قریب پہنچی ہے۔

غور فرمایئے کہ جو لوگ تہذیب و تمدن کے مدعی ہیں اور اپنے آپ کو انسانیت کا علمبردار تصور کرتے ہیں، انہوں نے کس کس طرح انسانیت کی دھجیاں اڑائی ہیں! ان وضاحتوں سے آپ کو یقیناً اس پروپیگنڈے کی حقیقت کا بھی اندازہ ہوا ہوگا، جو اسلام کے تصور جہاد اور پیغمبر اسلام کے عملی جہاد کے بارے میں آج پوری دنیا میں جاری و ساری ہے، افسوس کہ ہم مسلمان اپنی غفلت شعاری اور کوتاہ عملی کی وجہ سے دنیا کے سامنے اسلام کی حقیقی تصویر پیش کرنے اور پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت کی انسانیت نوازی کا پہلو پیش کرنے سے قاصر ہیں!

(۱۳ رستمبر ۲۰۰۲ء)

جہاد —— حقیقت اور فسانہ

انسان کی ایک کمزوری یہ ہے کہ جو بات اس سے بار بار کہی جاتی اور اس کے سامنے دہرائی جاتی ہے وہ اس کا یقین کر لیتا ہے، خواہ وہ بات کتنی ہی خلاف واقعہ کیوں نہ ہو، اس کی ایک مثال اس وقت ''جہاد'' کے عنوان سے پھیلائی جانے والی غلط فہمیاں بھی ہیں، مغربی ملکوں نے اپنی ظلم و زیادتی پر پردہ رکھنے اور اسلام کو بدنام کرنے کے لئے ''جہاد'' کو دہشت گردی کے ہم معنی قرار دے دیا ہے، اور پوری دنیا میں اسلام کے خلاف دہشت گردی کو عنوان بنا کر مہم چلائی جارہی ہے، اسرائیل فلسطین کی زمین پر قابض ہے، فلسطینی تارکین کو اپنے گھر واپسی کے حق سے محروم کئے ہوا ہے، اور خود یہودی بستیاں بسا رہا ہے، اسرائیل کا موجودہ وزیر اعظم ایریل شارون خوں آشام طبیعت کا انسان ہے اور اس نے نہتے عربوں کا قتلِ عام کیا ہے، اس کے باوجود انہیں دہشت گرد نہیں کہا جاتا، اور فلسطینی جب ان مظالم کے خلاف جدو جہد کرتے ہیں تو ان کی مدافعانہ کارروائیوں کو دہشت گردی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

خود ہمارے ملک ہندوستان میں جن طاقتوں نے علانیہ بابری مسجد کو شہید کیا، عدالتی احکام کی خلاف ورزی کی، بھاگلپور، میرٹھ اور مختلف علاقوں میں مسلمانوں کا قتل عام کیا، اور جو گجرات میں منصوبہ بند طریقہ پر مسلمانوں کی جان و مال کو تباہ کر رہے ہیں وہ دہشت گرد نہیں کہلاتے، اور اگر مسلمانوں کی طرف سے کسی ردِ عمل کا اظہار ہو تو اسے دہشت گردی کا نام دیا جاتا ہے، انڈونیشیا میں مشرقی تیمور کے علاحدگی پسندوں نے شورشیں برپا کیں تو انہیں دہشت گرد نہیں کہا گیا اور انڈونیشیا کو اس بات پر مجبور کر دیا گیا کہ وہ اس خطہ کو آزاد کر دیں، اسے دہشت گردی نہیں سمجھا گیا، سوڈان میں جنوبی علاقے

کے عیسائی آمادۂ بغاوت ہیں، تو اس کو جنگِ آزادی کا نام دیا جاتا ہے، روس سے متعدد عیسائی ریاستوں نے اپنی علاحدگی کا اعلان کیا، تو ان کے اس حق کو تسلیم کیا گیا۔ لیکن چیچنیا میں جب عوامی انتخاب کے ذریعہ ایک مسلم ملک وجود میں آیا تو اسے دہشت گرد کہا گیا اور پورا مشرق و مغرب مخالفت پر کمر بستہ ہوگیا بالآخر قطعاً ظالمانہ طریقہ پر اس مملکت کو صفحۂ ہستی سے مٹادیا گیا۔

مغرب کی سامراجی طاقتوں نے دہشت گردی کا عجیب پیمانہ مقرر کیا ہے جس میں ایک ہی عمل کہیں ''دہشت گردی'' قرار پاتا ہے، اور کہیں ''حقِ مدافعت'' اور اسلام کو مزید بدنام کرنے کے لئے ''جہاد'' کو بھی دہشت گردی سے مربوط کردیا گیا ہے، اس پس منظر میں یہ بات ضروری ہے کہ ہم جہاد کے صحیح مفہوم کو سمجھیں، اور ان حالات اور مواقع کو سامنے رکھیں جن میں جہاد کی اجازت دی گئی۔

عربی زبان میں '' جَہد'' (ج کے زبر کے ساتھ) کے معنی طاقت کے ہیں، اور جُہد (ج کے پیش کے ساتھ) کے معنی مشقت کے ہیں، جہاد اسلام کی اشاعت وحفاظت کے لئے اپنی پوری طاقت استعمال کرنے اور اس راہ میں ہونے والی مشقتوں کو انگیز کرنے کا نام ہے، گویا جہاد ایک وسیع مفہوم کی حامل اصطلاح ہے، جس کا مقصد حفاظتِ دین اور اشاعتِ دین کی کوشش و کاوش ہے، جہاد کے مختلف وسائل و ذرائع ہیں، زبان و بیان بھی جہاد کا ایک ذریعہ ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کی بات کہنے کو سب سے افضل جہاد قرار دیا: **أفضل الجهاد كلمة عدل عند السلطان الجائر**

(ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۴۰۱۱)

جہاد کا ایک ذریعہ اس زمانہ میں قلم بھی ہے، بلکہ یہ نہایت مؤثر ذریعہ ہے، کوئی مسلمان اپنا قلم دین کی حفاظت واشاعت کے لئے وقف کردے تو یہ بھی جہاد میں شامل ہے، آج کل دوسرے ذرائع ابلاغ بھی کسی فکر کی ترویج واشاعت اور اس کے غلبہ کے لئے نہایت مفید اور مؤثر ہیں، اور یہ بھی معنوی جہاد میں شامل ہیں۔

جہاد کی آخری اور سب سے مکمل صورت ''جہاد بالسیف'' ہے، یعنی اعداءِ اسلام کے

خلاف طاقت کا استعمال، لیکن اس کے لئے کچھ شرطیں اور تفصیلات ہیں، ایسا نہیں ہے کہ کسی مسلمان کی نظر جس غیر مسلم پر پڑ جائے یا جو غیر مسلم اس کی گرفت میں آجائے وہ اس کا کام تمام کردے، یہ جہاد نہیں بلکہ فساد ہے، جہاد کے سلسلہ میں قرآن نے ہمیں واضح طور پر بتایا کہ جو لوگ تم کو مرنے اور مارنے کے درپے ہوں تم بھی ان سے جہاد کرو، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ" (البقرہ:۱۹۰)

اللہ کے راستہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہوں، اور زیادتی نہ کرو کہ اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے۔

اس آیت میں دو باتیں بتائی گئی ہیں، اول یہ کہ جہاد کا آخری درجہ جسے قرآن مجید میں قتال سے تعبیر کیا گیا ہے، ان لوگوں سے ہے جو مسلمانوں سے برسر پیکار ہوں، جو مسلمانوں کے ساتھ بہتر رویہ رکھتے ہوں، ان سے قتال کا حق نہیں ہے، ایک اور موقع پر قرآن مجید نے اس حکم کو بہت ہی وضاحت کے ساتھ ذکر کیا ہے، ارشاد ہے:

"لَا یَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْۤا اِلَیْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ" (الممتحنہ:۸)

جو لوگ تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہ کرتے ہوں اور نہ تمہیں تمہارے گھروں سے نکالتے ہوں، اللہ تم کو ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں۔

یہ آیت صاف طور پر بتاتی ہے کہ جہاد کا حکم ان لوگوں سے ہے جو مسلمانوں سے آمادۂ جنگ ہوں، اور ظاہر ہے کہ اگر کوئی قوم دوسری قوم سے جنگ وجدال کا تہیہ کئے ہوئی ہو،

تو اگر ان سے جنگ نہ کی جائے گی تو کیا ان کے لئے پھول کی سیجیں بچھائی جائیں گی؟

اوپر جس آیت کا ذکر ہوا ہے، اس میں دوسری اہم بات یہ فرمائی گئی ہے کہ اسلام حالتِ جنگ میں بھی اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ مسلمان اخلاق اور انسانیت کی حدود کو پھلانگ جائیں، اسی کو قرآن مجید نے ''اعتداء'' یعنی ''زیادتی'' سے تعبیر کیا ہے، اور کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے، علامہ ابن کثیر نے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اور حسن بصری وغیرہ سے اس کی تشریح میں نقل کیا ہے کہ اس سے مراد دشمن کا مُثلہ کرنا عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو قتل کرنا، مذہبی شخصیتوں کا قتل اور درختوں کو جلانا ہے، (تفسیر ابن کثیر: ۱/۲۶۶) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے بھی منع فرمایا کہ کسی انسان کو جلانے کی سزا دی جائے، کہ اس سزا کا حق صرف اللہ کو ہے، مسلمانوں نے ہمیشہ اس ہدایت کو ملحوظ رکھا، انسانوں کو زندہ جلانے کی المناک اور انسانیت سوز صورت یا تو ان عیسائیوں کے یہاں ملتی ہے، جن کی مذہبی عدالتیں عقیدہ سے اختلاف رکھنے والوں کو زندہ نذرِ آتش کردیا کرتی تھیں، یورپ کی مذہبی اور اخلاقی تاریخ کی کتابوں میں بہ کثرت اس کا ذکر آیا ہے دوسرے ہندوستان میں بیوہ عورتوں کو ان کے شوہروں کے ساتھ جرم بے گناہی میں زبردستی جلا دیا جاتا تھا، جسے ستی کا نام دیا جاتا تھا، یہی ظالمانہ روایت ہے جس کو ابناء وطن اس وقت گجرات میں دہرا رہے ہیں۔

افسوس کہ مغربی ذرائع ابلاغ نے جہاد کے وسیع مفہوم کو صرف قتال میں محدود کردیا ہے، اور اسلام کی ایسی تصویر کھینچی گئی ہے، جس میں رواداری، تحمل، قوتِ برداشت اور دیگر اہلِ مذہب کے ساتھ حسنِ سلوک کی کوئی گنجائش ہی نہ ہو، بلکہ وہ چاہتا ہو کہ ہر ''غیر مسلم'' کو تہ تیغ کردے، یہ لفظ جہاد کی نہایت ہی غلط اور خلافِ واقعہ توضیح ہے، جو اسلام کے سر ڈال دی گئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بہ حیثیت مجموعی غیر مسلموں کے تین طبقے ہیں، ایک تو وہ غیر مسلم جو مسلم ممالک میں آباد ہوں، ان کو ''ذِمّی'' یا ''اہلِ ذِمّہ'' کہا جاتا ہے، دوسرے وہ غیر مسلم جن کے ساتھ اقتدار میں شرکت اور بقاء باہم کے اصول پر مسلمان ایک ملک میں رہتے

ہیں، اس طرح کے غیر مسلموں کے لئے فقہاء کے یہاں ''معاہد'' کی تعبیر ملتی ہے، یعنی وہ شخص جس سے عہد ہو چکا ہے، ان دونوں سے جہاد نہیں ہے، بلکہ رسول اللہ ﷺ نے ان کی جان و مال کو مسلمانوں ہی کی جان و مال کی طرح قابلِ احترام قرار دیا ہے، ''دماءھم کدمائنا و أموالھم کاموالنا''، ہاں اگر یہ مسلمانوں پر زیادتی کریں تو اپنی مدافعت کرنا اور قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے ان سے ظلم کا بدلہ لینا جائز ہے، اور دنیا کے ہر قانون میں انسان کے لئے اس حقِ مدافعت کو تسلیم کیا گیا ہے۔

جہاد ان لوگوں سے ہے جن سے مسلمانوں کا کوئی معاہدہ نہ ہو، وہ مسلمانوں کو اپنے دین پر عمل کرنے سے روکتے ہوں، اور انہیں ان کے وطن سے بے وطن کرنا چاہتے ہوں، جیسا کہ اس وقت اسرائیل فلسطینیوں یا سرب بوسینیائی مسلمانوں کے ساتھ کر رہے ہیں، ایسے لوگوں کے خلاف اسلام نے قتال کی اجازت دی ہے، اور یہ صرف اسلام کی بات نہیں، دنیا کے تمام مذاہب اور مہذب قوانین میں اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ جب کوئی قوم دوسری قوم پر زیادتی کرے تو اسے مدافعت اور جنگ کی اجازت اور ان سے جنگ کرنے کا حق حاصل ہے۔

آج دنیا کی بہت سی قومیں بلا وجہ محض مادی وسائل پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے دوسری قوموں پر حملہ زن ہو رہی ہیں، اور ایسے مہلک اسلحہ استعمال کر رہی ہیں، جن کی ہلاکت خیزیاں حساب وشمار سے باہر ہیں، بلا دلیل وثبوت اپنے مخالفین کو مجرم ٹھہرایا جاتا ہے اور بے مقصد جنگیں مسلط کر دی جاتی ہیں، لیکن اسے دہشت گردی نہیں کہا جاتا، اور مظلوم کی آہ وفغاں کو بھی سرکشی اور دہشت گردی سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ کس قدر غیر منصفانہ اور نامعقول رویہ ہے؟

ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان خود جہاد کی حقیقت سے واقف ہوں، اس بات کو جاننے کی کوشش کریں کہ جہاد کیا ہے؟ جہاد کن قوموں سے ہے؟ اور جہاد کا موقع و محل کیا ہے؟ تاکہ اسلام کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا کی جارہی ہیں اور جو زہر لوگوں کے ذہن میں بھی پیوست کیا جارہا ہے، وہ پوری بصیرت کے ساتھ اس کا جواب دے سکیں،

اور لوگوں کو زہر کا تریاق فراہم کرسکیں، افسوس کہ اسلامی لٹریچر سے بے توجہی اور اسلام کے بارے میں حد درجہ ناآگہی کی وجہ سے ہمارا یہ حال ہوگیا ہے کہ ہم دوسرے کی غلط فہمی تو کیا دور کرتے کہ خود ہی ان پروپیگنڈوں سے متاثر اور مرعوب ہوئے جاتے ہیں، اور خود ہمارا ذہن شکوک وشبہات کی تاریکی میں بے سمت ہوا جاتا ہے، ہمیں ایسے حساس موضوعات پر قرآن وحدیث کا مطالعہ کرنا چاہئے، سلف کی تحریروں سے رہنمائی حاصل کرنی چاہئے، اور اصحابِ نظر علماء سے صحیح صورتِ حال کو جاننے کی کوشش کرنی چاہئے!

(۲۶ر اپریل ۲۰۰۲ء)

اسلام —— دینِ اعتدال

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں جتنی چیزیں پیدا فرمائی ہیں، عام طور پر ان میں افراط وتفریط انسان کے لئے ناگوار خاطر اور دشوار ہوتی ہے، یہاں تک کہ انسان کے لئے مفید ترین چیزیں بھی اگر حدِ اعتدال سے بڑھ جائیں یا حدِ ضرورت سے کم ہو جائیں تو انسان کے لئے رحمت کے بجائے زحمت اور انعامِ خداوندی کے بجائے عذابِ آسمانی بن جاتی ہیں، ہوا انسان کے لئے کتنی بڑی ضرورت ہے؟ لیکن جب آندھیاں چلتی ہیں تو یہی حیات بخش ہوا کتنی ہی انسانی آبادیوں کو تاخت وتاراج کر کے رکھ دیتی ہیں، پانی زندگی وحیات کا سرچشمہ ہے، لیکن جب دریاؤں کی متلاطم موجیں اپنے دائرے سے باہر آجاتی ہیں تو کس طرح سبزہ زار کھیتوں اور شاد وآباد بستیوں کو خس وخاشاک کی طرح بہالے جاتی ہیں، قدرت کی اکثر نعمتوں کا یہی حال ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کا نظام اعتدال پر رکھا ہے، مثلاً ایک زمین کے نظام کشش ہی کو لے لیجئے، زمین میں جو قوت کشش اس وقت موجود ہے، اگر اس سے بڑھ جائے تو سائنس دانوں کا خیال ہے کہ انسان کا قد و قامت بلی اور چوہے کی طرح ہو جائے، اور بڑھ جائے تو انسان اونچے درختوں بلکہ تاڑ کے درختوں کے ہم قامت ہو جائے، غور کیجئے کہ اگر انسان کا قد اتنا چھوٹا یا اتنا بڑا ہو جائے تو یہ کتنی پریشان کن بات ہوگی؟ اللہ تعالیٰ نے سورج اور زمین کے درمیان ایک متوازن فاصلہ رکھا ہے، یہ فاصلہ بڑھ جائے تو زمین برف سے ڈھک جائے گی، اور گھٹ جائے تو زمین پر نا قابلِ برداشت گرمی ہوگی، قدرت کا پورا نظام اعتدال پر قائم ہے، اور یہ ترازو ربِ کائنات نے خود اپنے ہاتھ میں رکھی ہے، اسی لئے قرآن نے اللہ تعالیٰ کو ''رب العالمین'' قرار دیا ہے۔

جیسے اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے نظام کو اعتدال پر قائم فرمایا ہے، اسی طرح اللہ اپنے بندوں سے بھی اعتدال چاہتے ہیں، اور افراط وتفریط کو ناپسند فرماتے ہیں، قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں عدل کا حکم دیتے ہیں: اِنَّ اللّٰہَ یَامُرُ بِالْعَدْلِ (   ) عدل کی روح اعتدال ہے، اور جادۂ اعتدال سے ہٹ جانا ہی انسان کو ظلم کی طرف لے جاتا ہے، اعتدال زندگی کے کسی ایک شعبہ سے متعلق نہیں، بلکہ یہ زندگی کے ہر مرحلہ میں مطلوب ہے، قرآن وحدیث پر نگاہ ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ گفتار ورفتار، خوشی وغم، سلوک وبرتاؤ اور اللہ تعالیٰ کی عبادت ہر شعبۂ زندگی میں افراط وتفریط ناپسندیدہ ہے، اور اعتدال مطلوب ومحبوب ہے۔

اگر انسان چل رہا ہو تو اس کی رفتار معتدل ہونی چاہئے، اور اس میں اترانے کا انداز نہیں ہونا چاہئے، یہ چال کا اعتدال ہے، قرآن کہتا ہے کہ تم زمین میں اترا کر نہ چلو، کہ تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو، اور نہ پہاڑ کی بلندیوں کو چھو سکتے ہو: **ولا تمش فی الارض مرحا انك لن تخرق الارض و لن تبلغ الجبال طولا** (الاسراء:۳۷) بول چال میں اعتدال چاہئے، نہ ایسی پست آواز ہو کہ مخاطب سن بھی نہ سکے، نہ اتنی بلند ہو کہ حد اعتدال سے گذر جائے، قرآن کہتا ہے کہ آواز حسب ضرورت پست ہونی چاہئے، گدھے کی آواز بہت بلند ہوتی ہے، لیکن سب سے ناپسندیدہ: **واغضض من صوتك، ان انكر الاصوات لصوت الحمير** (..........)

لباس وپوشاک میں رسول اللہ ﷺ نے ایسے لباس کو پسند نہیں فرمایا جس کے پیچھے جذبۂ تفاخر کارفرما ہو، آپ خود سادہ لباس استعمال فرماتے اور آپ ﷺ نے سادہ لباس استعمال کرنے کی حوصلہ افزائی بھی فرمائی، لیکن یہ بھی مقصود نہیں کہ آدمی ایسے پھٹے کپڑے پہنے جو اس کے مصنوعی فقر کا مظہر ہو، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو نعمت سے سرفراز فرمائے، تو اس پر اس نعمت کا اثر نظر آنا چاہئے، غرض کہ نہ افراط ہو اور نہ تفریط، ایک طرف آپ ﷺ نے ڈاڑھی رکھنے کا بہ تاکید حکم فرمایا، (ترمذی، حدیث نمبر: ۲۷۶۳) دوسری طرف حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ چہرے کی چوڑائی اور لمبائی والے حصہ

سے آپ ﷺ کچھ داڑھی تراشا بھی کرتے تھے۔ (ترمذی، حدیث نمبر:۲۷۶۲)

دعاء کے بارے میں فرمایا کہ آواز بہت بلند نہ ہو بلکہ ایک حد تک پست ہو، بہت بلند آواز میں دعاء کرنے کو زیادتی قرار دیا گیا، **اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْیَۃً اِنَّہٗ لَایُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ** (الاعراف:۵۵) بالغ لڑکی کو خود اپنے نکاح کا حق دیا گیا، ارشاد ہے کہ بے شوہر خاتون بہ مقابلہ ولی کے خود اپنی ذات کی زیادہ حق دار ہے، (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۰۹۸) لیکن چوں کہ ولی کی شرکت کے بغیر عورت کی ناتجربہ کاری اسے نقصان پہنچا سکتی ہے، اس لئے یہ بھی فرمادیا گیا کہ ولی کی شرکت کے بغیر نکاح کا انعقاد بہتر نہیں: **لا نکاح الابولی** (ابوداؤد، حدیث نمبر:۲۰۸۵)

اگر کوئی شخص ظلماً قتل کیا گیا ہو تو حکم فرمایا گیا کہ مقتول کا ولی قاتل سے انتقام لے سکتا ہے، لیکن ضروری ہے کہ یہ بھی قاعدۂ قانون اور اصول کے دائرہ میں ہو، اور قتل میں حدود سے تجاوز نہ ہو: **ومن قتل مظلوما فقد جعلنا لولیہ سلطانا فلا یسرف فی القتل** (الاسراء:۳۳) انفاق اسلام میں کس قدر مطلوب اور پسندیدہ عمل ہے؟ لیکن قرآن نے یہاں بھی اعتدال پر قائم رہنے کا حکم دیا، اور فرمایا کہ نہ اپنے ہاتھ بالکل باندھ لو، اور نہ اتنا خرچ کرو کہ خود تمہارے لئے حسرت اور لوگوں کی ملامت کا سبب بن جائے، **لا تجعل یدك مغلولة الی عنقك و لاتبسطھا كل البسط فتقعد ملوما محسورا** (الاسراء:۲۹) ایک صحابی اپنی پوری جائیداد اللہ کے لئے وقف کرنا چاہتے تھے تو آپ ﷺ نے اعتدال کا حکم دیا اور غلو کو منع فرمایا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ مسلسل روزے رکھتے اور رات بھر نماز پڑھتے رہتے تھے، آپ ﷺ کو علم ہوا تو ناپسندیدگی ظاہر کی، اور فرمایا: کبھی روزے رکھو اور کبھی نہ رکھو، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی، کیوں کہ تم پر تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے، تمہاری جان کا بھی، اور تمہاری بیوی کا بھی، (بخاری، حدیث نمبر:۱۹۷۷) اسی طرح کی بات آپ ﷺ نے حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ سے بھی ارشاد فرمائی، (دیکھئے: ابوداؤد، حدیث نمبر:۱۳۶۹) اگر کسی شخص کو روزہ رکھنے کی طرف بڑی رغبت ہو تو اسے صوم داؤدی رکھنے کا حکم دیا گیا، یعنی حضرت داؤد علیہ السلام کے طریقہ پر عمل کرنے کا حکم ہوا، حضرت داؤد علیہ السلام کا عمل

یہ تھا کہ ایک دن روزہ رکھتے اور اگلے دن نہیں رکھتے ، آپ ﷺ نے اس کو روزہ رکھنے کا سب سے معتدل طریقہ قرار دیا: وهو اعدل الصيام وهو صيام داؤد،

(ابوداود، حدیث نمبر: ۲۴۲۷)

حلال وحرام میں بھی اللہ تعالیٰ نے اعتدال کا حکم فرمایا، جہاں اس بات کو منع کیا گیا کہ آدمی حرام کو اپنے لئے حلال کر لے، وہیں یہ بھی حکم فرمایا گیا کہ جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہو، دین میں غلو کا راستہ اختیار کرتے ہوئے حلال کو بھی حرام نہ کرلیا جائے، وَلَاتُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَاتَعْتَدُوْا (المائدہ: ۸۷) جہاد میں دین و ایمان اور نفس و جان کا علانیہ دشمن سامنے ہوتا ہے، لیکن اس موقع پر بھی راہِ اعتدال کی رہنمائی کی گئی، کہ جو تم سے برسرِ جنگ ہو تمہاری جنگ ان ہی لوگوں تک محدود ہونی چاہئے، اور اس سے آگے تجاوز نہیں کرنا چاہئے: وَقَاتِلُوْا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا (البقرۃ: ۱۹۰) انسان جوشِ انتقام میں جادۂ انصاف سے ہٹ جاتا ہے اور حدِ اعتدال سے گذر جاتا ہے، اس لئے فرمایا گیا کہ اگر کسی نے تم پر ظلم کیا ہو تو تمہارے لئے اس کے ظلم کے بقدر ہی اقدام کی گنجائش ہے، جواب میں تمہارے لئے انصاف کے دائرہ سے آگے بڑھ جانا درست نہیں: فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ.

(البقرۃ: ۱۹۴)

جب نفرت کا ماحول پیدا ہوتا ہے اور کسی گروہ کی طرف سے زیادتی کا واقعہ پیش آتا ہے تو فطری طور پر غضب کی آگ بھڑک اٹھتی ہے، اور یہ آگ انصاف کے تقاضوں کو سوکھے پتوں کی طرح جلا کر رکھ دیتی ہے، قرآن نے خاص طور پر تاکید کی کہ گو اعداء اسلام نے تمہیں مسجدِ حرام سے روک رکھا ہے لیکن ان کی یہ برائی بھی تمہیں انصاف کا دامن چھوڑ دینے اور انتقام کی نفسیات سے مغلوب ہو کر تمہارے آمادۂ ظلم ہو جانے کا باعث نہ بنے، (المائدہ: ۲) —— تنقید اور احترام میں بھی میانہ روی مطلوب ہے، یہ جائز نہیں کہ کسی کی فکر پر تنقید کرتے ہوئے اس کی ذاتیات کو بھی نشانہ بنایا جائے، رسول اللہ ﷺ نے اپنے بدترین دشمنوں کے ساتھ بھی ایسا نہیں کیا، اور اس بات سے بھی منع کیا گیا کہ احترام میں غلو کی

صورت پیدا ہو جائے، اسی لئے غیر اللہ کو سجدہ کرنے اور کسی کے سامنے اپنے آپ کو جھکانے سے منع کیا گیا۔

عام طور پر دو چیزیں انسان کو راہِ اعتدال سے منحرف کر دیتی ہیں، محبت اور عداوت، محبت انسان سے بصیرت ہی نہیں، بصارت بھی چھین لیتی ہے، اور اسے اپنے محبوب کی برائیوں میں بھی بھلائیاں نظر آتی ہیں، یہی حال نفرت وعداوت کا ہے، دشمن میں رائی جیسی برائی ہو تو وہ پہاڑ محسوس ہوتی ہے، اور پہاڑ جیسی خوبی ہو تو وہ رائی سے بھی حقیر نظر آتی ہے، اسلام سے پہلے جو قومیں گمراہ ہوئی، ان کی گمراہی کا باعث یہی ہوا، غلو آمیز محبت، یا انکار و نفرت، اسلام نے اسے اس میں بھی اعتدال کا حکم دیا ہے، دشمن بھی ہو تو اس کی غیبت اور بہتان تراشی سے منع فرمایا گیا، دوست اور مرکز عقیدت ہو تب بھی اس کی تعریف میں غلو اور مبالغے اور تملق وخوشامد کو ناپسند کیا گیا، قرآن مجید کہتا ہے کہ کسی سے عداوت ہو، تو اس کو بھی حد اعتدال سے باہر نہ جانے دے، ممکن ہے کہ کل ہو کر اللہ تعالیٰ تمہارے اور اس کے درمیان محبت پیدا فرمادے! عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً (الممتحنہ: ۷) رسول اللہ ﷺ نے اپنے ارشاد کے ذریعہ اسے مزید واضح فرمایا، حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: اپنے دوست سے حدِ اعتدال میں رہتے ہوئے دوستی کرو، بعید نہیں کہ کسی دن وہی تمہارا دشمن بن جائے، اور اپنے دشمن سے بھی بغض میں اعتدال رکھو، کیا عجب کہ کسی دن تمہارا دوست بن جائے، (ترمذی، حدیث نمبر: ۱۹۹۸) غرض کہ دوستی اور دشمنی میں بھی اعتدال ہو۔

جو قوم دنیا کے لئے عدل اور اعتدال کی امانت لے کر آئی تھی، اور جس سے دنیا کی قوموں نے میانہ روی کا سبق سیکھ کر تہذیب و ثقافت کی منزلیں طے کیں اور شہرت و ناموری کے بام کمال تک پہنچیں، آج وہی امت افراط وتفریط، بے اعتدالی اور غلو کا عنوان بن گئی ہے، زندگی کا کون سا شعبہ ہے، جس میں ہم نے بے اعتدالی کو اختیار نہیں کیا، تعمیری کاموں میں ہمارا بخل اور بے فائدہ کاموں میں ہماری فضول خرچی دونوں کی مثال نہیں ملتی۔ احترام وعقیدت میں ذرہ کو آفتاب بنانا اور اختلاف وعداوت میں چھوٹی چھوٹی باتوں کو

وجہ انتشار بنانا ہمارا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے، ہمارا ایک گروہ حکومتِ وقت کے اشارہ پر آگ کو پانی کہنے میں بھی نہیں شرماتا، اور ہمارا ایک طبقہ چنگاری جیسے واقعہ پر خود شعلہ بن جاتا ہے، لوگوں کے ساتھ سلوک کے معاملہ میں ہماری بے اعتدالی دن رات کا مشاہدہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ افراط وتفریط آخرت میں اللہ کی پکڑ اور دنیا میں قوموں کی رسوائی کا سامان ہے، اور اعتدال ومیانہ روی آخرت میں سرخروئی اور دنیا میں کامیابی کی کلید!!

(۸؍مارچ ۲۰۰۲ء)

مجسمہ کا انہدام ــــ غور وفکر کے چند پہلو

افغانستان دو ہزار سال پہلے بودھوں کے زیرِ حکومت تھا، اس وقت بودھوں نے اس خطہ کے مختلف شہروں میں بودھ کے مجسمے تعمیر کئے تھے، پہاڑوں کو تراش کر قصور ومحلات تیار کرنا اور مجسمے بنانا اس عہد کا خاص فن تھا، اور غالباً وسطِ ایشیا کے علاقہ میں بودھوں نے اس کو بہت فروغ دیا، کہا جاتا ہے کہ افغانستان کا شہر بامیان کسی زمانہ میں بودھ حکومت کا دارالحکومت تھا، چنانچہ اس شہر میں دو نہایت ہی عظیم الشان اور دیو ہیکل مجسمے جن کی بلندی ۵۳ اور ۳۸ میٹر ہے، اونچی پہاڑیوں سے تراش کر بنائے گئے تھے، اس وقت طالبان نے پورے ملک افغانستان سے مجسموں کے انہدام اور انہیں بے نام ونشان کر دینے کی کاروائی شروع کی ہے، یہ دونوں مجسمے اس کی زد میں ہیں، اس کارروائی نے پوری دنیا میں ایک آگ سی لگادی ہے، مشرق ومغرب اور شمال وجنوب سے اس کے خلاف آوازیں اٹھ رہی ہیں، ہمارا ملک ہندوستان جو اپنے ملک میں ہونے والی بڑی سے بڑی زیادتی کو بھی داخلی مسائل کا نام دے کر دوسروں کے اعتراض کو رد کرنے کا عادی ہے، وہ بھی اس کے خلاف بیان بازی میں پیش پیش ہے اور مسلم ممالک جن کا رویہ ادھر عرصہ سے مسلمانوں کے مسائل میں نہایت ہی بزدلانہ ہوا کرتا ہے، وہ بھی اس موقع پر طالبان کو اپنی ''نصائح'' سے مستفید کرنے کی کوشش کرر ہے ہیں۔

ہمیں اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا انصاف کے ساتھ جائزہ لینا چاہئے، طالبان کے اس اقدام میں کئی پہلوؤں پر غور کرنے کی ضرورت ہے، اول یہ کہ عالمی ذرائع ابلاغ اور عالمی طاقتوں کا رویہ کیا عدل پر مبنی ہے، یا ایسے مسائل میں دوہرا رویہ اختیار کیا جاتا ہے؟ دوسرے ہمارا ملک ہندوستان کیا بودھوں سے واقعی محبت

رکھتا ہے اور ان کا ہمدرد ہے؟ یا یہ محض بودھوں میں مسلمانوں کے تئیں نفرت پیدا کرنے کی ایک سازش ہے؟ تیسرے دوسرے مذاہب کے آثار کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کیا ہے؟ اور کیا طالبان کا عمل اسلامی نقطۂ نظر کی واقعی نمائندگی کرتا ہے؟

کوئی حقیقت پسند اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ جو رویہ آج طالبان نے بودھ مجسموں کے بارے میں اختیار کیا ہے، مغربی دنیا اس سے کہیں زیادہ سنگین اور ستم انگیز معاملات پر خاموشی اختیار کرتی رہی ہے، اگر ان کا تعلق مسلمانوں سے ہو، بوسینیا میں بے قصور اور نہتے مسلمانوں کے ساتھ کیا کچھ مظالم نہ ڈھائے گئے، بوڑھوں، بچوں کا قتل عام کیا گیا، بوڑھی خواتین سے لے کر نابالغ لڑکیوں تک کی برسرِ عام آبروریزیاں کی گئیں، کتنی ہی تاریخی مسجدوں کو شہید کردیا گیا اور یہ سب کچھ امریکہ و برطانیہ جیسے ممالک کی درپردہ مدد کے ذریعہ کیا گیا۔ صابرہ اور شتیلہ میں اسرائیلیوں نے قتل عام کیا، اور ہزاروں عربوں کو ان کے گھر سے جبراً نکال دیا گیا، مسجد اقصیٰ کو آگ لگائی گئی، دنیا کے مختلف عیسائی ملکوں میں مسلمانوں کے ساتھ ناقابلِ بیان مظالم ڈھائے جارہے ہیں، یوبائی کیلوفورنیا میں دس لاکھ ڈالر خرچ کرکے ایک مسجد تعمیر کی گئی، جسے ۱۹۹۵ء میں دہشت گرد عیسائی تنظیموں نے جلا کر خاکستر کردیا، لیکن ان خونریز اور انسانیت سوز واقعات پر نہ مغرب کا دل بے قرار ہوا، نہ مشرق کی رگِ انسانیت پھڑکی، لیکن عجیب بات ہے کہ انسانی خون سے ہولی کھیلنے والے اور معصوم انسانوں کی لاشوں پر رقص وسرود کی محفلیں جمانے والے آج بے جان مجسموں کے انہدام پر اس قدر گریہ کناں اور مشغول آہ وفغاں ہیں کہ گویا اس سے زیادہ خراب اور تکلیف دہ کوئی واقعہ پیش ہی نہ آیا ہو،

روسیوں کے افغانستان سے جانے کے بعد سے پورے ملک افغانستان میں باضابطہ کسی حکومت کا وجود نہیں تھا، باہم خوں ریزیوں کا سلسلہ جاری تھا اور اندیشہ تھا کہ یہ ملک چھوٹی چھوٹی قبائلی ٹکریوں میں بکھر کر رہ جائے گا، ان حالات میں طالبان اٹھے اور انہوں نے ملک کی قیادت اپنے ہاتھوں میں لی، اور دیکھتے ہی دیکھتے ملک کے ۹۵ فیصد سے بھی زیادہ علاقوں پر ان کی مستحکم حکومت قائم ہوگئی، انہوں نے ملک کو امن وآشتی اور

عدل وانصاف سے ہمکنار کیا، اوراس ملک کی وحدت کو برقرار رکھا، ان کی یہ فتحمندی صرف ان کی فوجی طاقت کا نتیجہ نہیں تھی، بلکہ اللہ کی مدد ان کے ساتھ تھی، اور امن کے لئے بے قرار عوام ہر جگہ ان کے استقبال کے لئے چشم براہ تھے۔ انصاف اور معقولیت کا تقاضہ یہ تھا کہ طالبان کی حکومت کو تسلیم کیا جاتا، اور انہیں عالمی اداروں میں نمائندگی دی جاتی، ایسی صورت میں افغانستان سے دنیا بھر کے روابط برقرار رہتے، اوران سے صلح کی میز پر گفتگو کرنا ممکن ہوتا؛ لیکن جو ممالک آج دور سے آہ وزاری کررہے ہیں، انہوں نے خود ہی اس دروازہ کو بند کررکھا ہے جس سے کوئی مصالحانہ گفتگو کی راہ ہموار ہوسکتی تھی۔

ہمارے ملک ہندوستان کے لئے ایک محب وطن کی حیثیت سے صحیح مشورہ یہی ہوسکتا ہے کہ اسے پہلے اپنے گھر کی خبر لینی چاہئے، بابری مسجد جو کئی سو سال قدیم مسجد تھی، جس میں نمازوں کا سلسلہ جاری تھا، اور جہاں پہلے مندر ہونے کی کوئی دلیل موجود نہیں، اسے علانیہ شہید کردیا گیا، اور جن بدبختوں نے مسجد کو شہید کیا، وہی آج قومی ہیرو بنے ہوئے ہیں، اور اب تک اس ظلم وناانصافی کی تلافی کی طرف کوئی قدم بھی نہیں اٹھا گیا تو جو لوگ ایک ایسی عبادت گاہ کو منہدم کرنے کے مجرم ہوں جس میں عبادت کرنے والے لوگ اس ملک بلکہ اس شہر میں بالفعل ابھی موجود ہوں، وہ ایک ایسے مجسمہ کے انہدام پر اعتراض کرنے کا کیا حق رکھتے ہیں؟ کہ اس ملک میں اس مذہب سے تعلق رکھنے والا ایک متنفس بھی اب موجود نہیں۔

پھر برادرانِ وطن کو کچھ اپنے دامن کے داغ پر بھی نظر کرنی چاہئے، اور سوچنا چاہئے کہ بودھوں پر ہندوؤں سے بھی بڑھ کر کسی قوم نے مظالم ڈھائے ہیں، ہندوستان تو پورا ملک ہی بودھوں کا تھا، ہندوؤں اور آریاؤں نے ان پر ایسے مظالم ڈھائے کہ انہیں ہندوستان چھوڑ، چین، جاپان، کمبوڈیا، برما، اور سری لنکا وغیرہ کے علاقوں کی پناہ لینی پڑی، یہاں تک کہ بعض بودھ مندروں پر آج بھی ہندوفرقہ پرستوں نے قبضہ کررکھا ہے، اجنتا اور ایلورا کے غار جن میں بودھ خانقاہیں تھیں، وہ بودھوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے جوروستم پر گواہ ہیں، کہ بودھ راہب جب ترکِ وطن پر مجبور ہوگئے تو انہوں نے اپنی ان عظیم الشان

خانقاہوں کو مٹی سے بند کر دیا؛ تا کہ وہ ان کے دشمنوں کی دست برد سے محفوظ رہیں، یہ بھی دلیری کی انتہا ہے کہ آپ نے جس قوم کو غلام بنایا ہے، جن کے لہو سے ہولی کھیلی، اور جنہیں ترک وطن پر مجبور کر دیا، آپ ان مظالم پر خود شرمندہ ہونے کے بجائے دوسروں کو زیادتی کا طعنہ دیں، اور اپنے آپ کو اس قوم کے ایک ہمدرد اور بہی خواہ کی حیثیت سے پیش کریں، واقعہ ہے کہ ہندوستان جب تک بابری مسجد کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داری کو پوری نہ کر لے، اس کو یہ بات بالکل زیب نہیں دیتی کہ وہ اپنے مسائل پر اظہارِ خیال کرے۔

جہاں تک اس سلسلہ میں اسلامی نقطۂ نظر کی بات ہے تو دو باتیں بالکل واضح ہیں:

اول یہ کہ اسلام کی تمام تعلیمات کا خلاصہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت ہے، اور ایک مسلمان کے لئے شرک کسی بھی درجہ میں قابلِ قبول نہیں ہوسکتا، جیسے ایک غیرت مند شوہر بیوی کی ہر کمزوری کو سہہ سکتا ہے، اور ہر ناز کو برداشت کر سکتا ہے، لیکن اس کی بدچلنی کو گوارا نہیں کر سکتا، اسی طرح ایک صاحبِ ایمان کے لئے خدا کے ساتھ شرک کا معاملہ قطعاً نا قابلِ برداشت ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں شرک کو اسی تمثیل سے سمجھایا ہے، جو قوم پہلے سے شرک میں مبتلا ہو، اس کے لئے نئے خداؤں کو وجود میں لانا یا کسی نئی طاقت کو خدا مان لینے کا مسئلہ چنداں دشوار نہیں؛ کیوں کہ اگر کوئی شخص سو خداؤں کو مانتا ہو تو ۱۰۱ واں خدا اس کے عقیدہ کو متاثر نہیں کرتا؛ بلکہ شاید ان کو خوشی ہی ہو کہ اسے ایک اور بھگوان ہاتھ آ گیا ہے، اسی لئے ہندو بھائی یہ پیشکش کرتے رہے ہیں کہ جہاں ہم اور بھگوانوں کی پرستش کرتے ہیں، ہم محمد (ﷺ) کی پرستش کرنے کو بھی تیار ہیں **والعیاذ باللہ**، لیکن جو شخص ایک خدا پر ایمان رکھتا ہو، اور اس ایک کے ماسوا سبھوں کا انکار کرتا ہو، اس کے لئے مختلف چوکھٹوں پر سر جھکانے اور مختلف آستانوں پر جبینِ بندگی خم کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں، اور اگر خدانخواستہ کوئی مسلمان اس کی جرأت کر لے، تو وہ مسلمان باقی ہی نہیں رہتا، یہ عقیدہ توحید اتنا معقول قانونِ فطرت سے ہم آہنگ اور مدلل ہے کہ جو لوگ شرک کے مرتکب ہیں، وہ بھی تھوڑی سی گفتگو اور تبادلۂ خیال کے بعد خدا کی وحدت کو قبول کرنے کے سوا چارہ نہیں پاتے، یہ عجیب بات ہے کہ انسان اپنے معاملہ میں تو اس قدر غیرت مند ہو کہ اپنی بیوی اور اپنے بچوں کی

یا خود اپنی ذرا بھی غلط نسبت کو برداشت نہیں کرے، لیکن اپنے خالق و مالک کے معاملہ میں اس قدر بے غیرت اور تساہل سے عاری، کہ ہر دن نئے خالق و مالک کی اپنے ہاتھوں تخلیق کرتا جائے، اور اس مسئلہ پر تفکر وتدبر کے لئے بھی تیار نہ ہو۔

دوسرا اصول مذہبی رواداری اور دوسروں کے مذہبی جذبات کی رعایت کا ہے، رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لے گئے، تو آپ ﷺ اس بات پر قادر تھے کہ یہودیوں کی مذہبی عبادت گاہ کو منہدم کرا دیتے، لیکن آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں شام اور فلسطین کا علاقہ فتح ہوا، جہاں عیسائیوں کے بڑے چرچ اور گرجا تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں اپنے حال پر رکھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب فتح بیت المقدس کے موقع سے وہاں تشریف لے گئے اور کلیسا کے متولی کی اجازت بلکہ خواہش پر ایک چرچ میں نماز ادا کی، تو پھر اسی چرچ کے لئے ایک خصوصی دستاویز مرحمت فرمائی، کہ کہیں مسلمان اس کو مسجد میں تبدیل کر دینے کی کوشش نہ کریں، اس کے بعد متولیان چرچ کی خواہش کے باوجود آپ نے چرچ میں نماز ادا نہیں فرمائی کہ مسلمان جبراً اس کو اپنی عبادت گاہ بنانے کی کوشش کریں گے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے دمشق کی جامع مسجد تعمیر فرمائی تو اس سے متصل ایک چھوٹا سا چرچ تھا، آپ رضی اللہ عنہ نے عیسائیوں سے پیشکش کی کہ یہ منہ مانگی قیمت لے کر مسجد کو دے دیں، تا کہ مسجد کے صحن کو وسعت دی جا سکے، مگر عیسائیوں نے نہیں مانا تو آپ خاموش ہو گئے، حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ اپنے گورنروں کو ہدایت فرماتے تھے کہ مفتوحہ علاقوں میں کوئی کلیسا یا آتش کدہ منہدم نہ کیا جائے، مصر کا علاقہ جہاں اہرام مصر واقع ہے، اور جن میں فرعون کے مجسمے بھی ہیں، عہدِ فاروقی ہی میں فتح ہو گیا، لیکن مسلمانوں نے عہد شرک کی ان یادگاروں کو منہدم کرنے اور مٹانے کی کوئی کوشش نہیں کی، یہی وجہ ہے کہ آج تک یہ عجائبِ عالم مصر کی زمین پر موجود ہیں، یہی حال دوسرے علاقوں کا ہے، خود افغانستان کا علاقہ ابتدائی دور ہی میں فتح ہوا ہے، اور کم وبیش پونے چودہ سو سال سے وہاں مسلمانوں کی حکومت ہے، افغانستان میں توقع ہے کہ بعض صحابہ نے بھی قدم رنجہ فرمایا ہوگا، تابعین تو بہت سے آئے ہوں گے، اور اولیاء صالحین تو نہ جانے کتنے پیدا ہوئے ہوں، لیکن ان

حضرات نے اس کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

یہ صحیح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع سے بیت اللہ شریف کے بتوں کو منہدم فرمایا، اور مکہ میں جہاں کہیں جو بت تھے، انہیں صاف کرنے کا حکم دیا، لیکن یہ ایک استثنائی واقعہ ہے، مکہ دینِ توحید اسلام کا اعتقادی دارالخلافہ ہے، اس لئے ضروری تھا کہ وہاں شرک کے مظاہر باقی نہ رہیں، پھر اس شہر کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بسایا تھا، اور اس گھر کو خالصۃً ایک اللہ کی عبادت کے لئے اللہ کے ان دو بندوں نے بنایا تھا، اس طرح یہ ابتداء ہی سے توحید کا مرکز تھا، جسے ناروا طریقہ پر بت پرستی کا مرکز بنانے کی کوشش کی گئی تھی، اس لئے پیغمبر اسلام ﷺ نے یہ قدم اٹھایا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت طالبان کا یہ اقدام مصلحتِ وقت کے خلاف اور ان لوگوں کو نفع پہونچانے والا ہے جو مسلمانوں کو دہشت گرد اور شدت پسند بتاتے ہیں، اور اسلام کے خلاف طرح طرح کی نفرت انگیز غلط فہمیاں پھیلا رہے ہیں، دوسری طرف ایک ایسا ملک جو صد فی صد مسلمان ہے، اور جہاں ان مجسموں کی پہلے سے بھی کوئی پذیرائی نہیں تھی، وہاں ان کا باقی رہنا چنداں مضر نہیں تھا، ان حالات میں اس رواداری اور وسیع النظری کی راہ کو اختیار کرنا بہتر ہوتا جو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ اور مسلمانوں کی تاریخی روایات کے مطابق ہے اور اس طرح کا عمل بسا اوقات ردِ عمل کو جنم دیتا ہے، اور یہ ہرگز بہتر بات نہ ہوگی کہ کوئی مسلمان ناشائستہ ردِ عمل کا سبب بنے، قرآن نے اسی لئے معبودانِ باطل کو بُرا بھلا کہنے سے منع کیا، کہ اگر مسلمان ایسا کریں تو وہ بھی جواب میں شانِ باری تعالیٰ میں گستاخی کے مرتکب ہوں گے، اور بالواسطہ طریقہ پر ہم اس کا سبب بنیں گے۔

(۱۶/ مارچ ۲۰۰۱ء)

کیا کافر کہنا توہین ہے؟

کوئی انسان خود اپنی مرضی اور خواہش سے دنیا میں پیدا نہیں ہوا ہے، اور نہ کوئی شخص اپنی خواہش اور مرضی سے دنیا سے واپس ہوتا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی اور طاقت ہے جو انسان کو دنیا میں بھیجتی ہے، اور ایک مقررہ وقت کے بعد اسے واپس بلا لیتی ہے، یہ کون سی طاقت ہے؟۔ اس سلسلہ میں ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ سب اس فطرت کی کرشمہ سازی ہے جو پوری کائنات میں جاری و ساری ہے، جو لوگ خدا کا انکار کرتے ہیں اور ملحد و دہریہ ہیں، کائنات کے وجود اور اس کے بقاء کے سلسلہ میں ان کا یہی نقطۂ نظر ہے، دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ فطرت کو پھر بھی ایک خالق کی ضرورت ہے، جس نے مختلف چیزوں میں الگ الگ صلاحتیں رکھی ہیں، ایسا کیوں ہوا کہ آگ جلاتی ہے اور پانی ٹھنڈک دیتا ہے، ایسا بھی ہوسکتا تھا کہ آگ ٹھنڈی ہوتی اور پانی گرم ہوتا، گلاب کی فطرت میں سرخی اور موتیے کی فطرت میں سفیدی رکھی گئی، بکری ایک مسکین طبیعت جانور ہے اور شیر درندہ صفت، یہ اختلاف فطرت کیوں ہے؟ پھر اگر زندگی اور موت فطرت کے تابع ہوتی ہر شخص کو ایک متعینہ وقت پر ہی موت آتی، ہر شخص ایک مقررہ وقت پر ہی باپ بنتا، لیکن ایسا نہیں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اس قانونِ فطرت کا بھی کوئی خالق ہے، جس کے سامنے فطرت سرِ تسلیم خم کیے ہوئی ہے، اور پل پل اس کے حکم کی تابعدار ہے، اسی اَن دیکھے وجود کا نام ''خدا'' ہے، خدا کے ماننے والوں کے مقابلہ، خدا کا انکار کرنے والوں کی تعداد ہمیشہ معمولی اور انگلیوں پر قابلِ شمار رہی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا یقین بجائے خود فطرتِ انسانی کا ایک حصہ ہے، دنیا میں جتنے مذاہب پائے جاتے ہیں، قریب قریب یہ ان سب کے درمیان قدرِ مشترک ہے،

جو لوگ خدا پر یقین رکھتے ہیں وہ اس بات کو بھی ماننے پر مجبور ہیں کہ ان کو اسی طریقہ کو اپنانا چاہئے جو خدا کی طرف سے ان کے لئے مقرر کیا گیا ہو، کیوں کہ جو کسی مشین کو بناتا اور وجود میں لاتا ہے اسی کی ہدایت کے مطابق وہ چیز استعمال بھی کی جاتی ہے، خدا کے بتائے ہوئے طریقۂ زندگی کا نام ''دین'' ہے اور اسی کو لوگ ''مذہب'' سے بھی تعبیر کرتے ہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دو متضاد چیزیں بیک وقت درست نہیں ہو سکتیں، اگر کوئی شخص یہ کہے کہ دن و رات ایک ہی ہے، روشنی اور اندھیرا جدا گانہ حقیقتیں نہیں ہیں، میٹھا اور نمکین ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں، تو یہ بات یقیناً سچائی کے خلاف ہوگی، یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ اگر کسی کو میٹھا پسند ہو تو نمکین پسند کرنے والوں کو برا بھلا نہ کہے، اگر کسی کو اندھیرا بھاتا ہو تو وہ روشنی پسند کرنے والوں سے الجھے نہیں، لیکن یہ کہنا کہ روشنی اور اندھیرا دونوں کی حقیقت ایک ہی ہے، یقیناً ایک خلافِ عقل اور خلافِ واقعہ بات ہوگی۔

اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اصل دین ایک ہی ہے، اسی دین کو لے کر پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام اس کائنات میں اترے، اسی کی دعوت حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دی، اسی نعرۂ حق کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور انبیاء بنی اسرائیل نے اپنے اپنے عہد میں بلند فرمایا، ہر قوم اور ہر زبان میں اسی صراطِ مستقیم کی سوغات لے کر انبیاء و رسل پہونچے، جس کا سلسلہ آخری پیغمبر جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر مکمل ہوا، **إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ** (آل عمران:۱۹)۔ اس لئے اسلام وحدتِ دین کا قائل ہے نہ کہ وحدتِ ادیان کا، خدا نے کھانے کے لئے الگ نالی بنائی ہے، اور سانس لینے کے لئے الگ نالی، اگر کوئی شخص سانس کی نالی میں کھانے کا لقمہ رکھ دے، تو اس کی جان کے لالے پڑ جائیں گے، اسی طرح، نجات کی طرف لے جانے والا راستہ ایک ہی ہے، یہ کہنا کہ راستے الگ الگ ہیں اور منزل ایک ہی ہے، بظاہر ایک اچھا نعرہ معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ تمام دواؤں کا ایک ہی اثر ہوتا ہے۔

جو لوگ مذاہب کے بارے میں ایسی باتیں کہتے ہیں، وہ دراصل مذہب کے معاملہ میں سنجیدہ نہیں ہیں، جو لوگ ایک خدا کو مانتے ہوں، جو تین خداؤں پر یقین رکھتے ہوں،

اور جو تین کرور خداؤں کے سامنے سر جھکاتے ہوں، یہ سب برابر کیسے ہو سکتے ہیں، اور کیوں کر سوچا جا سکتا ہے کہ بیک وقت یہ تمام باتیں درست ہوں گی؟ جن لوگوں نے خدا کی طاقت کو مختلف لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیا ہے، اور جن کے نزدیک خدا قادرِ مطلق ہے، اس کی طاقت میں کوئی شریک وسہیم نہیں، یہ دونوں سچائی پر کیسے ہو سکتے ہیں؟ اس لئے یہ کہنا کہ تمام مذاہب حق ہیں، راستے الگ الگ ہیں اور منزل ایک ہی ہے، اپنے آپ کو اور دوسروں کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے۔

ایسی صورت میں ہر مذہب کو اپنے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے لئے کوئی نہ کوئی تعبیر اختیار کرنی ہوتی ہے، اس تعبیر کے لئے ایک طریقہ تو یہ ہے کہ جو دوسرے مذہب پر یقین رکھنے والے لوگ ہیں، ان کے لئے اہانت آمیز لفظ استعمال کیا جائے، جیسے ہندو مذہب کی بعض کتابوں میں غیر ہندو کے لئے ملیچھ (ناپاک) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ دوسروں کے لئے اہانت آمیز تعبیر ہوگی، دوسری صورت یہ ہے کہ ایک تعبیر اس مذہب کے ماننے والوں کے لئے ہو اور ایک اس کے نہ ماننے والوں کے لئے، جس کا مقصد ان کے نقطۂ نظر کا اظہار ہو، اکثر آسمانی کتب میں یہی صورت اختیار کی گئی ہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والوں کو یہوداہ کی نسبت سے یہودی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھنے والوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت سے عیسائی کہا گیا اور تورات وانجیل میں اس زمانے کے اس دین حق پر ایمان نہ رکھنے والوں کے لئے ''کافر'' کا لفظ استعمال کیا گیا اور اس انکار کو ''کفر'' کہا گیا۔

یہی تعبیر آخری، مکمل اور محفوظ کتاب ہدایت قرآن مجید میں بھی اختیار کی گئی ہے، جو لوگ اس کی تعلیمات پر یقین رکھنے والے ہیں ان کو ''مسلم'' یا ''مومن'' کہا گیا، یعنی احکام اسلام کو ماننے والا اور اسلامی تعلیمات پر یقین رکھنے والا، اور اس کے انکار کو کفر کے لفظ سے تعبیر کیا گیا، چنانچہ قرآن مجید میں دینِ اسلام سے انحراف اور اس انحراف پر یقین رکھنے والوں کے لئے مختلف صیغوں میں کفر اور کافر کا لفظ ۴۹۴ بار استعمال کیا گیا ہے، مگر یہ کوئی نئی تعبیر نہیں ہے۔

عربی زبان میں کفر کے اصل معنی چھپانے کے آتے ہیں، اسی لئے رات کے لئے بھی کافر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، کہ وہ بھی اپنے پردۂ ظلمت میں لوگوں کو چھپاتی ہے، کاشتکار چوں کہ بیج کو زمین کی تہہ میں چھپا دیتا ہے، اس لئے عربی زبان میں کاشتکار کو بھی بعض اوقات کافر سے تعبیر کیا جاتا ہے، (مفردات القرآن: ٢/٥٥٩)۔ غالباً اسی مناسبت سے یہ لفظ سمندر اور اندھیرے بادل کے لئے بھی استعمال ہوا ہے (القاموس المحیط /٦٠٥)۔ کہ سمندر اپنی تہوں میں کتنی ہی جمادات و نباتات کو چھپائے ہوئے ہے، اور گھنا بادل دھوپ اور فضاء میں پائی جانے والی چیزوں کے لئے حجاب بن جاتا ہے، جو شخص ناشکرا اور جذبۂ شکر سے عاری ہو، وہ گویا اپنے محسن کی طرف سے آنے والی نعمت کو پردۂ خفا میں رکھ دیتا ہے۔ اس لئے ناشکری کے لئے بھی کفر کی اصطلاح استعمال ہوئی، خود قرآن مجید میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ (مفردات القرآن: ٢/٥٥٩)

کسی بھی زبان میں ایک لفظ کا جو حقیقی معنی ہوتا ہے وہ براہِ راست اور بالواسطہ مناسبتوں کی وجہ سے نئے نئے پیکر میں ڈھلتا رہتا ہے، ناشکری میں نعمتوں سے جحود وانکار کا معنی پایا جاتا تھا، اس مناسبت سے کافر کا معنی مطلق انکار کرنے والا قرار پایا، اور جو لوگ اسلامی عقیدہ اور نظامِ حیات کو نہ مانتے ہوں، ان کے لئے کافر اور ان کی انکاری فکر کے لئے کفر کا لفظ استعمال ہونے لگا، **واعظم الکفر جحود الوحدانیة أو الشریعة أو النبوة** (مفردات القرآن: ٢/٥٥٩)۔ قرآن مجید میں بھی غیر مسلموں کے لئے کافر کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا، علمائے یہود سے کہا گیا کہ تم اسلام کے اولین منکر نہ بن جاؤ: **وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ** (البقرۃ: ٤١)۔ قرآن نے ایک موقع پر حج کو فرض قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ جو اس کو نہ مانے تو اللہ تعالیٰ کو کوئی پرواہ نہیں: **مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ** (آل عمران: ٩٧) مشرکین مکہ آخرت کے جزاء و سزا کے منکر تھے؛ چنانچہ ان کے انکارِ آخرت کو قرآن میں اس طرح تعبیر کیا گیا: **وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ** (یوسف: ٣٧)

یہاں کفر کے معنی انکار کرنے اور تسلیم نہ کرنے کے ہی ہیں، قرآن نے قیامت کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا ہے کہ اہلِ دوزخ جب شیطان پر لعنت ملامت کریں گے، تو شیطان

نہایت ڈھٹائی سے کہے گا کہ تم نے جو مجھ کو خدا کا شریک ٹھہرایا تھا، میں اس کا انکار کرتا ہوں، اس انکار کو قرآن نے کفر کے لفظ سے تعبیر کیا ہے: اِنِّیْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ (ابراہیم:۲۲) اسی طرح حضرت موسیٰ پر ایمان لانے اور سحر کا انکار کرنے والے کے شرک سے منکر ہونے کو لغوی معنی میں کفر سے تعبیر کیا گیا ہے: وَ لَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّ اِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ (الزخرف:۳۰)

دیکھئے یہاں توحید کے انکار کو نہیں بلکہ شرک کے انکار کو کفر کے لفظ سے تعبیر کیا گیا، گویا لغت کی رو سے کفر کے معنی، چھپانے، ناشکری کرنے، انکار کرنے اور نہ ماننے کے ہوئے۔

قرآن نے جو اسلام نہ قبول کرنے والوں کو کافر کہا ہے، وہ اسی معنی میں ہے کہ یہ شخص اسلامی تعلیمات کا انکار کرتا ہے، گویا کافر کے معنی غیر مسلم کے ہوئے؛ جیسے کوئی شخص ہندو نہ ہو تو اس کو غیر ہندو، اور عیسائی نہ ہو تو اس کو غیر عیسائی کہا جاتا ہے، اسی طرح جو شخص اسلام کو نہ مانتا ہو اسے غیر مسلم کہا جائے گا، عربی زبان میں اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ''کافر'' کا لفظ ہے، یعنی ایسا شخص جو خدا کو ایک نہ مانتا ہو، اور اسلامی افکار و معتقدات کا قائل نہ ہو، اس میں نہ کوئی خلافِ واقعہ بات ہے، نہ کسی کی اہانت ہے، نہ نفرت و عداوت کا اظہار ہے، اگر کسی غیر مسلم کو مسلمان زبردستی مسلمان کہتے، جیسا کہ ہمارے ہندو بھائی ان لوگوں کو بھی ہندو کہنے پر مصر ہیں، جو پوری وضاحت وصراحت اور اصرار کے ساتھ اپنے ہندو ہونے کا انکار کرتے ہیں، تو یہ یقیناً ان کی توہین کی بات ہوتی، پس حقیقت یہ ہے کہ اگر اس لفظ کے معنی پر غور کیا جائے، تو جن لوگوں کے لئے یہ تعبیر اختیار کی جارہی ہے، ان کے لئے یہ تعبیر محض ان کے نقطۂ نظر کا اظہار ہے، نہ کہ یہ عداوت ونفرت پر ابھارنے والی تعبیر ہے۔

پھر غور کیجئے کہ قرآن مجید میں زیادہ تر اہلِ مکہ کو کافر کے لفظ سے مخاطب کیا گیا ہے، اگر اس تعبیر میں توہین اور تمسخر مقصود ہوتا، تو عرب جو اس زبان کے رمز آشنا اور ذوقِ ادب کے حامل تھے، وہ اس پر معترض ہوتے۔ لیکن اہلِ مکہ کی طرف سے کوئی ایسا احتجاج سامنے

نہیں آیا، بلکہ خود غیر مسلم اپنے کافر ہونے کا اقرار واعتراف کرتے تھے، اور کہتے تھے، کہ تم جو پیغام لے کر آئے ہو ہم اس سے کفر کرتے ہیں: اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (الزخرف:۲۴)

عجب بات ہے کہ اس وقت اسلام کے خلاف مغربی میڈیا اور سنگھ پریوار نے جو بے جا شورش شروع کر رکھی ہے، وہ ایسی تیز آندھی کی طرح ہے، کہ اس میں اڑنے والے خس وخاشاک کو بھی لوگوں نے گل وثمر سمجھ رکھا ہے، اور دنیا آنکھ بند کر کے اس پر آمین کہتی جاتی ہے، سنگھ پریوار کے لوگ تو اپنے تعصب اور جہالت میں اس قسم کی بے معنی باتیں کہتے ہی رہتے ہیں، پچھلے دِنوں بمبئی کی ایک عدالت کا جو فیصلہ سامنے آیا، وہ نہایت حیرت کا باعث ہے، کہ اس لفظ کے اصل معنی ومقصود کو سمجھے اور اس کی مناسب تحقیق کئے بغیر اس کو توہین آمیز اور نفرت انگیز تعبیر قرار دے دیا گیا، کسی مسلمان کو کافر کہنا تو یقیناً اس کی توہین ہے۔ کیوں کہ یہ اس کے دعویٰ اسلام کو جھٹلانے کے مترادف ہے، لیکن جو شخص مسلمان نہ ہو، اس کو کافر کہنا ایک سچائی کا اظہار ہے نہ کہ توہین۔

(۱۰ رمئی ۲۰۰۲ء)

مذہب کی تبدیلی

تمل ناڈ حکومت نے تبدیلیٔ مذہب کے سلسلہ میں جو آرڈینس جاری کیا ہے، وہ فرقہ پرست عناصر کو خوش کرنے کا ایک حربہ اور ہندوستان کے جمہوری اقدار کا علانیہ قتل ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندو سماج میں ایک عرصہ سے مذہب کی تبدیلی کا سلسلہ جاری ہے، ہندو مذہب میں بنیادی طور پر کوئی ایسا ٹھوس عقیدہ نہیں پایا جاتا، جس کو ہندو عقیدہ اور آئیڈیالوجی کا نام دیا جاسکے، جو لوگ رام کو بھگوان اور خدا مانتے ہوں، وہ بھی ہندو ہیں، اور جو گ راون کو خدا قرار دیتے ہوں اور رام کو بُرا بھلا کہتے ہوں وہ بھی ہندو مذہب ہی کے علمبردار ہیں، اور نہرو وغیرہ جیسے دانشور جو مورتی پوجا اور دیوی دیوتاؤں کے وجود کو توہم پرستی قرار دیتے ہوں وہ بھی ہندو ہیں، غرض ہندو مذہب موم کی ناک ہے، اس کی جو صورت چاہو، بنالو، توہم پرستی ہی کے نتیجے میں طبقاتی تقسیم ہندو عقیدہ کا اٹوٹ جزء ہے، اور اسی لئے ہندستان میں ہزاروں سال سے دبے کچلے ہوئے لوگوں کا احساس ہے کہ ہندو مذہب دراصل مذہبی قالب میں ''برہمن واد'' کی حفاظت سے عبارت ہے، اس نظام نے صدیوں سے دلت اور پست طبقات کو اپنے طاقتور پنجہ میں دبا رکھا ہے، جب بھی انہوں نے انگڑائی لینے کی کوشش کی، نہایت ذہانت کے ساتھ ان پر اپنی گرفت اور مضبوط کردی گئی۔

حالاں کہ ہمارا موجودہ جمہوری ڈھانچہ ذات پات کے تصور کی نفی کرتا ہے، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ آج بھی برہمنوں کی تعداد تو چار، پانچ فیصد سے زیادہ نہیں، حکومت کے کلیدی عہدوں پر ان کی تعداد ۶۴ فیصد ہے، سیاسی تبدیلیوں سے چہرے بدلتے ہیں، لیکن اس حقیقت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی، آج تک پست اقوام میں کوئی شنکراچاریہ، اور مٹھ کا سربراہ نہیں بن سکا، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہندو قوم میں یہ مسئلہ محض ایک سماجی

مسئلہ نہیں، بلکہ اس کی جڑیں عقیدہ کی گہرائیوں میں پیوست ہیں، ان حالات نے دبے کچلے لوگوں کو اس بات پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ ہندوازم کے اس قید خانے سے اپنے آپ کو باہر نکالیں، اور باعزت انسان کی طرح سماج میں زندہ رہیں، اس کے لئے مشہور رہنما امبیڈکر نے بودھ ازم کو قبول کیا، لیکن جلد ہی سمجھ دار اور باشعور لوگوں نے اس حقیقت کو سمجھ لیا کہ یہ شراب کو آب سمجھنے کے مترادف ہے، بدھسٹ سماج کو ہندو سماج نے اس طرح جذب کر لیا ہے کہ گویا یہ قید خانہ کی ایک کوٹھری سے نکل کر دوسری کوٹھری میں داخل ہونا ہے، وہی سماج، وہی تہذیب، وہی رسوم و رواج، بس خداؤں میں ایک خدا کا اضافہ، یا کچھ دیوتاؤں کی تبدیلی، یہاں تک کہ دستورِ ہند کے مطابق بھی اسی تبدیلی مذہب کے باوجود وہ ہندو ہی شمار کیا جاتا ہے، لوگ یہ بھی محسوس کرنے لگے ہیں کہ جن مذاہب کی پیدائش اور نشو ونما ہندوستان کی سرزمین میں ہوئی ہے، برہمنوں نے اپنی ذہانت سے ان کا ایسا ''ہندوکرن'' کر دیا ہے، کہ اب کسی کے لئے ان مذاہب میں سے کسی کو اختیار کرنے کے باوجود ہندو سماج کے مظالم سے نجات پانا اور انصاف حاصل کرنا ممکن نہیں۔

اس لئے بے چین اور بے قرار ذہن وفکر رکھنے والوں کے لئے دو ہی راستے رہ گئے ہیں، عیسائیت یا اسلام؟ اس سے کسی حقیقت پسند غیر مسلم کو بھی انکار نہیں کہ اسلام کے عقائد اور اصول جتنے صاف و شفاف، عقل وفطرت سے ہم آہنگ، متوازن اور انسانی ضروریات کے لئے موزوں اور مناسب ہیں، کسی اور مذہب میں اس کی مثال نہیں ملتی، اللہ کی وحدت اور انسانوں کی وحدت، یہ اسلام کا انقلابی تصور ہے، اور دونوں ایک دوسرے سے مربوط ہیں، اگر خدا ایک ہے، اس کا کوئی خاندان، کنبہ نہیں، اور کسی انسانی طبقہ سے اس کی قرابت مندی اور رشتہ داری نہیں تو اس سے خود بخود انسانی وحدت اور مساوات کا تصور ابھرتا ہے، پھر اسلام میں کوئی عقیدہ '' پہیلی '' کی طرح نہیں کہ اس کا سمجھنا مشکل اور سمجھانا مشکل تر ہو، جیسا کہ ہمارے عیسائی بھائیوں کے یہاں ایک میں تین اور تین میں ایک کا تصور ہے، یا عقیدۂ کفارہ ہے کہ غلطی کوئی کرے اور سزا حضرت مسیح کو جھیلنی پڑے، اسی لئے مسلمان حالانکہ اس ملک میں بہت تھوڑی تعداد میں آئے، لیکن اس ملک

کے باشندوں نے جو طبقاتی تقسیم کی وجہ سے ظلم و جور سے دو چار تھے، اور دیوتاؤں کی ایک فوج کی پرستش کرتے کرتے عاجز آچکے تھے، انہوں نے اسلام کی دعوت پر لبیک کہا، افغانستان سے لے کر بنگلہ دیش اور برما تک جو مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد موجود ہے وہ اسلام کی اسی کشش کا نتیجہ ہے۔

بعض لوگ غلط فہمی پیدا کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے اس ملک میں جبراً تبدیلیٔ مذہب کرایا ہے، لیکن یہ ایسا جھوٹ ہے کہ خود عقلِ عام اس کو جھٹلاتی ہے، ہندوستان کی جنوبی اور ساحلی علاقوں میں تو اسلام حضرت عمر فاروق ﷺ ہی کے عہد میں آچکا تھا، اور نہ صرف پرجا بلکہ بعض راجاؤں نے بھی اسلام قبول کیا تھا، اس وقت یقیناً درہ جبر سے کوئی فوجی قافلہ ہندوستان نہیں پہونچا تھا، اس وقت جبر و دباؤ کی کیا گنجائش تھی؟ پھر غور کیجئے کہ مسلمانوں نے اس ملک کے مختلف حصوں پر کم و بیش آٹھ سو سال تک حکومت کی ہے، آج جب حکومت کے بغیر ہندو سماج میں تبدیلیٔ مذہب کا طوفان اٹھا ہوا ہے، اور کئی ریاستوں میں آبادی کا توازن بدل چکا ہے، تو اگر اتنا طویل عرصہ جبر و دباؤ سے کام لیا جاتا تو کیا یہ ملک مسلم اکثریت نہیں بن گیا ہوتا؟، حقیقت یہ ہے کہ جبر و دباؤ تو الگ چیز ہے، مسلمان حکمرانوں نے تو عام طور پر اسلام کی تبلیغ و دعوت کی طرف بھی توجہ نہیں کی، اور اشاعتِ دین کی طرف سے انتہائی تغافل برتا، ورنہ اگر اس سلسلہ میں تھوڑی بھی کوشش کی جاتی تو اسلام میں جو کشش ہے، یہی لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کرنے کے لئے کافی ہوتی۔

اسلام کے بعد اس ملک کے لوگوں کے لئے زیادہ قابلِ توجہ مذہب عیسائیت ہے، اور اس میں شبہ نہیں کہ پچھلے سو سال میں ہندوؤں کی بہت بڑی تعداد نے عیسائیت کو قبول کیا ہے، اور جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، کئی ریاستوں میں تو عیسائیت اکثریتی مذہب بن گیا، میرے خیال میں اس کی بنیادی وجہ دو ہے، ایک تو مادی وسائل کا استعمال، ہسپتال، درسگاہیں، اور معاشی فلاح کے مراکز کے قیام و انتظام نے عیسائیت کو اس بات کا موقع فراہم کیا کہ مقامی آبادی میں اثر و نفوذ حاصل کرے اور ان میں داخل ہو سکے، دوسرے گو عیسائیت ایک عالمی مذہب اور ترقی یافتہ قوم کا مذہب ہونے کی وجہ سے ہندوازم کے ساتھ

مکمل طور پر جذب نہیں کی جاسکتی، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ عیسائیت کا کوئی سماجی تشخص، نہیں ہے، شادی، بیاہ، سماجی رسم ورواج وغیرہ میں وہ ہندو سماج ہی کا ایک حصہ بن گئے ہیں، ان کے پاس حلال وحرام اور جائز وناجائز کا کوئی مکمل نظام حیات نہیں، جوان پر قیود وحدود عائد کرتا ہو اور اپنے پہلے معمولات سے روکتا ہو، اکثر اوقات تو نام بھی تبدیل نہیں کئے جاتے، بس کچھ تہواروں کا فرق ہوتا ہے، شرک پہلے بھی تھا، اور اب بھی ہے، مورتی کی پرستش پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے، اس لئے جب کوئی ہندو عیسائی مذہب قبول کرتا ہے تو اسے بہت ہی معمولی تبدیلیوں سے گذرنا پڑتا ہے، اس کی عملی زندگی میں تو کوئی انقلاب آتا ہی نہیں، اور اسے فکر وعقیدہ کے اعتبار سے بھی کسی غیر معمولی تبدیلی سے گذرنا نہیں پڑتا۔

اسلام مذہب کے معاملہ میں دورنگی اور دوعملی کو روا نہیں رکھتا، اسلام قبول کرنے کا مطلب خداؤں میں ایک خدا کا اضافہ نہیں، بلکہ اللہ سے رشتہ جوڑ کر تمام توہمات سے رشتہ توڑنا ہے، اس کی عبادتیں الگ ہیں، اس کے تہوار الگ ہیں، وہ غیر مسلم خاندانوں سے شادی بیاہ کا تعلق قائم نہیں رکھ سکتا، وہ ایمان لانے کے بعد اپنے والدین کے ترکہ سے حصہ نہیں پاسکتا، اس کو کھانے، پینے، خریدنے، بیچنے، کمانے غرض زندگی کے ہر شعبہ میں حلال وحرام کی حدیں قائم کرنی پڑتی ہیں، اور حرام سے بچنا پڑتا ہے، دین یقیناً آسان ہے، لیکن جو نفس کی ہر خواہش پر لبیک کہنے کا عادی بن چکا ہو، اس کے لئے حق پر گامزن ہونا لوہا کو چنا چبانے کے مترادف ہے، گویا مسلمان ہونے کے بعد انسان ایک سماج سے دوسرے سماج کی طرف ہجرت کرتا ہے، اس لئے یہ پھولوں کی سیج نہیں، بلکہ کانٹوں کا فرش ہے، اسی بناء پر جو لوگ خدا سے ڈر کر سچائی اور حقیقت کی تلاش کے جذبے سے معمور ہوکر اور عزم وارادہ کی قوت سے مسلح ہوکر قدم اٹھانا چاہیں، وہی اس راہ پر آسکتے ہیں، کسی بھی شخص کو حقیر، معمولی اور مادی مقاصد کے تحت اس راہ میں آبلہ پائی کا حوصلہ نہیں ہوسکتا، چنانچہ ایک تو ان مشکلات اور دوسری طرف دعوتِ اسلام کے کاموں سے غفلت کی بناء پر آزاد ہندوستان میں عیسائیت کی طرف ہندو سماج کا رجوع زیادہ ہوا ہے۔

ہندوستان ایک سیکولر اور جمہوری ملک ہے، جو ہر شخص کو اپنے ضمیر کی آواز پر عمل

کرنے کی گنجائش فراہم کرتا ہے، چنانچہ دستورِ ہند کے بنیادی حقوق کی دفعہ: ۲۵ میں تمام شہریوں کے لئے آزادی ضمیر اور آزادی سے مذاہب پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کا مساوی حق شامل ہے، اس لئے سنگھ پریوار کا ''دھرم پری ورتن'' پر چیں بہ جبیں ہونا یقیناً ہندوستان کے دستور سے بغاوت کرنے کا مترادف ہے، اپنی بیماری کو دور کرنے کے بجائے ان لوگوں کو بُرا کہنا جو بیماری کو بیماری سمجھتے ہیں، بے وقوفی ہی کہی جاسکتی ہے۔

اسلام نے بھی ضمیر و اعتقاد کی آزادی کو تسلیم کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے صاف ارشاد فرمایا کہ ہدایت گمراہی کے مقابلہ واضح ہو چکی ہے، لہٰذا دین کے معاملہ میں کوئی جبر و دباؤ نہیں ہے ''لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ '' (البقرۃ:۲۵۶) رسول اللہ ﷺ سے صاف ارشاد فرمایا گیا کہ آپ کا کام صرف نصیحت کرنا ہے، آپ داروغہ نہیں ہیں کہ ان کو اپنی بات ماننے پر مجبور کر دیں ''إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ'' (الغاشیہ:۲۱،۲۲) ایک موقع پر ارشاد ہوا کہ اگر اللہ چاہتا تو تمام انسان ہی مومن ہو جاتے، پھر کیا آپ لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کر دیں گے؟ ''أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ '' (یونس:۹۹) پیغمبر اسلام ﷺ کو ہدایت فرمائی گئی کہ اگر وہ آپ کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیں تو آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں، آپ پر تو محض یہ ہے کہ پیغامِ ہدایت کو صاف صاف اور کھلے طور پر پہونچا دیں، اور بس: ''فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (النحل:۸۲) آپ سے فرمایا گیا کہ جو لوگ کفر پر بہ ضد ہیں ان سے کہہ دو کہ تمہارے لئے تمہارا دین ہے، اور میرے لئے میرا دین، لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ (الکافرون:۶) ایک اور موقع پر آپ کی زبان سے کہلا گیا کہ ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال: لَنَا اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ (الشوریٰ:۱۵)، غرض عقیدہ و ضمیر کی آزادی کا قائل اسلام بھی ہے، وہ کسی شخص کو مسلمان ہونے پر مجبور نہیں کرتا، ہاں جہاں اسلامی حکومت ہو اور ایک شخص نے مسلمان ہونے کی حیثیت سے شہریت قبول کی ہو اور حقوق حاصل کئے ہیں، اس کا اسلام سے کفر کی طرف سفر کرنا نہ صرف روشنی سے تاریکی کی طرف سفر کرنا ہے، بلکہ گویا ملک سے بغاوت ہے، اور بغاوت کسی بھی سیاسی نظام

میں ناقابلِ برداشت ہے، اسی لئے جہاں اسلامی حکومت ہو وہاں ارتداد موجب قتل ہے۔

بہر حال تبدیلیٔ مذہب پر ہونے والی یہ بحثیں مسلمانوں کے لئے مایۂ عبرت ہیں کہ ہندو سماج جو پاکیزہ مذہبی تصورات اور عقل انسانی سے ہم آہنگ عقائد سے محروم اور توہمات کے شکنجہ میں قید ہے، اور جو روحانی سکون کے لئے مضطرب اور طبقاتی تقسیم کی وجہ سے مظلوم اور ستم رسیدہ ہے، اسلام جیسا صاف ستھرا، پاکیزہ، روحانی اور اخلاقی قدروں سے معمور، عقل وفطرت کے تقاضوں سے ہم آہنگ، انقلاب انگیز، اور انسانیت کی اصلاح کے لئے غیر معمولی صلاحیت کا حامل اور اثر انگیز مذہب وعقیدہ کا حامل ہونے کے باوجود انہوں نے اپنے فرائض سے بے اعتنائی برتی، اور آج تک بھی ہم کوئی منظم اور منصوبہ بند، دعوتی اور تبلیغی سعی وکاوش نہیں کر رہے ہیں، حالاں کہ یہی فریضہ ہے، جو نصرت خداوندی کی کلید اور خدا کے غیبی نظام کے تحت مسلمانوں کی حفاظت وصیانت کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔

(یکم نومبر ۲۰۰۲ء)

اسلام اور غیر مسلم

اسلام ''سلم'' سے ماخوذ ہے، جس کے معنی صلح و سلامتی کے ہیں، اور ''ایمان'' ''امن'' سے ہے جو ظاہر ہے کہ امن و آشتی کو بتلاتا ہے، گویا صلح و سلامتی اور امن و آشتی اس دین کی خمیر میں داخل ہے، اسلام کی تمام تعلیمات اس کے اس مزاج و مذاق کی آئینہ دار ہیں، اس نے محبت کا سبق سکھایا ہے، اللہ سے محبت، اللہ کے رسول سے محبت، مسلمانوں سے محبت، پوری انسانیت سے محبت اور تمام مخلوقات سے محبت، غرض یہ دین دینِ محبت ہے، نہ کہ دین نفرت، یہ مذہب اخوت کا مذہب ہے نہ کہ عداوت کا، یہ صلح کی دعوت ہے نہ کہ جنگ کی، اس نے اس وقت محبت کی شمع جلائی جب ہر طرف بغض و عناد کی تاریکی چھائی ہوئی تھی، اور انسانوں کا ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔

مگر افسوس کہ جو لوگ صدیوں سے نفرت کے سوداگر ہیں، جو شب و روز انسانیت کو ہلاک و برباد کرنے والے ہتھیاروں کی تیاری میں مصروف کار ہیں، اور جو پوری دنیا میں انسانوں کی تباہی و بربادی کے اسباب کی تجارت کر رہے ہیں، اور یہی ان کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ اور دنیا پر ان کے رعب و دبدبہ کا سبب و وسیلہ ہے، وہی اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں دہشت گردی اور انتہا پسندی کے پروپیگنڈے کر رہے ہیں، اور یہ پروپیگنڈہ اس شد و مد اور قوت کے ساتھ ہو رہا ہے کہ مشرق و مغرب گویا اس پر ایمان لا چکا ہے، یہاں تک کہ خود بعض مسلمان بھی شکوک و شبہات میں مبتلا ہیں۔

جب بھی کوئی ایسا موقع آتا ہے، جس میں پروپیگنڈے کی اس آنچ کو تیز کرنے کا موقع ہو، تو ہمارا میڈیا ہرگز اسے ضائع ہونے نہیں دیتا، بلکہ نمک مرچ لگا کر اس میں اضافہ ہی کرتا ہے ـــــــ اس کی ایک مثال ''طالبان'' سے متعلق حالیہ خبریں ہیں، پہلے یہ

خبر آئی کہ طالبان ہندو اقلیت کو افغانستان سے نکال باہر کرنا چاہتے ہیں، پھر یہ ہوا کہ انہوں نے ہندو اقلیت پر زرد کپڑے پہننے کا لزوم کردیا ہے، پھر یہ خبر آئی کہ ان کے لئے زرد شناختی کارڈ بنائے گئے ہیں، ان خبروں کو ہمارے ذرائع ابلاغ نے بلا تحقیق بلکہ طالبان کی وضاحت کے باوجود بہ اصرار اتنا پھیلایا کہ اس سے اکثریتی فرقہ میں بجا طور پر اشتعال کی کیفیت پیدا ہوئی، مسلمانوں کے تئیں نفرت میں اضافہ ہوا، ظاہر ہے کہ یہ ایک منصوبہ بند سازش ہے، اور اس کا مقصد پوری دنیا میں مسلمانوں کے وقار کو متاثر کرنا اور ہندوستان میں ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے تئیں مخالفانہ جذبات کو ہوا دینا ہے، طالبان کی طرف سے یہ وضاحت آچکی ہے کہ انہوں نے اقلیت پر کسی خاص لباس کا لزوم نہیں کیا ہے، بلکہ ان کے لئے محض شناختی کارڈ زرد رنگ کا جاری کیا گیا ہے، اور وہ بھی اس لئے کہ افغانستان میں مسلمانوں پر نماز باجماعت قانونی طور پر لازم قرار دی گئی ہے، غلط فہمی میں بعض دفعہ افغان پولیس غیر مسلموں کو بھی مسجد جانے کا پابند بناتی تھی، اس پر وہاں کے غیر مسلموں نے حکومت سے خواہش کی کہ ان کے لئے کوئی ایسی شناخت فراہم کی جائے کہ پولیس والے انہیں تنگ نہ کرسکیں، اسی پس منظر میں ان کے لئے زرد شناختی کارڈ جاری کیا گیا ہے، تاکہ پولیس کو پہچاننے میں سہولت ہو، اور غیر مسلم بھائیوں کو کوئی دشواری نہ ہو۔

غور کیجئے کہ طالبان کے اس عمل میں اقلیت کی ایذا، اور ضرر رسانی کا جذبہ کارفرما ہے یا ان کی سہولت و آسانی کا؟ مختلف مصلحتوں کے لئے یہ بات مروج ہے کہ مخصوص کارڈ جاری کئے جاتے ہیں، بعض مغربی ملکوں میں شہریت کے کئی درجات ہوتے ہیں، اور ہر درجے کے لئے الگ الگ رنگوں کے کارڈ بہ طورِ شناخت ہوتے ہیں، اس میں تذلیل و تحقیر مقصود نہیں ہوتی، اگر طالبان نے بھی غیر مسلم بھائیوں کی سہولت اور اپنی قانونی مصلحت کے پیش نظر کوئی شناختی کارڈ جاری کیا ہو، تو اس میں کیا قباحت ہے؟ اور اسے کیوں کر ناانصافی کہا جاسکتا ہے؟

اس موقع پر اس امر کی وضاحت مناسب ہوگی کہ غیر مسلموں کے بارے میں

اسلام کا رویہ کیا ہے؟ —— انسانی عزت وتکریم اسلام کی بنیادی فکر میں داخل ہے، بلکہ اگر کہا جائے کہ اسلام میں اسی کو عقیدہ کا درجہ حاصل ہے، تو بے جا نہ ہوگا، قرآن نے کہا ہے: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ، کہ اللہ نے بنی آدم کو کرامت وشرف کا تاج پہنایا ہے، قرآن نے انسان کے جسمانی قالب کو سب سے بہترین سانچہ قرار دیا ہے: لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ قرآن نے بتایا ہے کہ حضرت آدم فرشتہ جیسی عظیم مخلوق کے بھی مسجود تھے، اور قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ تمام انسان حضرت آدم ہی سے پیدا ہوئے ہیں: خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ یہ انسانی کرامت کا پہلو بلا امتیاز مذہب تمام انسانوں کے احترام کا تصور عطا کرتا ہے، اس لئے غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ بھی تحقیر واہانت کا سلوک روا نہیں۔

اس بات کو آپ ﷺ نے اپنی مختلف تعلیمات کے ذریعہ واضح فرمایا، آپ ﷺ نے جنگ کے دوران نعش کا مثلہ کرنے سے منع فرمادیا، غزوۂ خندق کے موقع سے جب ایک مشرک حملہ آور ہوا اور مارا گیا تو اہلِ مکہ نے لاش کی قیمت اداکرنی چاہی، لیکن آپ ﷺ نے نفرت وانتقام کی آگ کے عین شباب کے وقت بھی اس کو گوارا نہیں فرمایا کہ انسانی جسم کی قیمت وصول کی جائے، ایک یہودی کا جنازہ گذر رہا تھا آپ ﷺ کھڑے ہوگئے، صحابہ نے عرض کیا: یہودی کا جنازہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ آخر وہ بھی تو انسان ہے، آپ نے غیر مسلم بادشاہوں اور قبائل کے سرداروں کو خطوط لکھے تو ان کے احترام کا پورا پاس ولحاظ رکھا، بعض مشرکین آپ ﷺ کے یہاں مہمان ہوئے تو آپ ﷺ نے پورا اکرام فرمایا اور مہمان نوازی کا حق ادا کیا، غرض کہ انسانی تکریم اور احترام کے اعتبار سے آپ ﷺ نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان فرق نہیں کیا۔

اسلام نے غیر مسلموں کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کی تعلیم دی، ماں باپ، بال بچوں، بھائی بہنوں، بیوی اور دوسرے رشتہ داروں، پڑوسیوں اور سفر کے ساتھیوں، مقروضوں اور کمزوروں، بیماروں اور مسافروں وغیرہ کے ساتھ حسنِ سلوک کے جو بھی احکام دیئے گئے، ان کو مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں رکھا گیا، بلکہ اسی سلوک کا حکم تمام انسانوں کے لئے

دیا گیا، رسول اللہ ﷺ نے اہلِ مکہ پر قحط کے موقع سے ایک بڑی رقم ان کی اعانت کے لئے عطا فرمائی، ام المومنین حضرت صفیہؓ نے اپنے یہودی رشتہ داروں کو تیس ہزار درہم تقسیم فرمائے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے بکری ذبح کروائی اور پڑوسیوں کو بھیجنے کی ہدایت فرمائی، واپسی پر دریافت فرمایا کہ کیا یہودی ہمسایہ کو بھی اس میں سے بھیجا گیا؟ جب جواب نفی میں ملا تو خاص طور پر ان کو بکرے کا گوشت بھیجا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک مشرک بھائی کو تحفہ بھیجا، رسول اللہ ﷺ نے اسیران بدر کو نئے جوڑے پہنا کر رخصت فرمایا، غرض کہ رشتہ، پڑوس، مجبوری وغیرہ کی بناء پر نیز عمومی طور پر حسن سلوک کا حکم جیسے مسلمانوں کے لئے ہے ویسے ہی غیر مسلم بھائی کے لئے بھی ہے۔

جان اور زندگی کا تحفظ غیر مسلموں کا اسی طرح واجب ہے جس طرح مسلمانوں کا۔ جو غیر مسلم مسلم ملک میں رہتے ہوں، یا اس ملک میں نہ رہتے ہوں، لیکن مسلمانوں کا ان سے معاہدہ ہو، ان کے بارے میں حضور ﷺ نے ایک اصول بیان فرمادیا کہ ان کا خون ہمارے خون کی طرح، اور ان کے مال ہمارے مال کی طرح ہے: "**دمائهم كدمائنا و اموالهم كاموالنا**" اس لئے جو دیت (خون بہا) مسلمانوں کے لئے ہے، وہی غیر مسلموں کے لئے ہے، جیسے کسی مسلمان کے قتل پر قصاص واجب ہے، اسی طرح غیر مسلم کے قتل پر بھی قصاص واجب ہے، — اسی طرح کسب معاش، ملکیت مال اور حفاظت جائداد کے حق میں مسلمان اور غیر مسلم دونوں برابر ہیں، جیسے کسی مسلمان کا مال چوری کرنے پر ہاتھ کاٹنے کی سزا ہے، اسی طرح غیر مسلم کا مال چوری کرنے پر بھی۔

سب سے اہم مسئلہ مذہبی حقوق کا ہے، اسلام مذہب کے معاملہ میں جبر وتشدد کا قائل نہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **لا اکراہ فی الدین**، اس رواداری کی بہترین مثال وہ معاہدہ ہے جو آپ نے مدینہ آنے کے بعد مسلمانوں، یہودیوں اور مشرکین کے درمیان کرایا تھا، اور جس کے تحت ہر ایک کو اپنے مذہب پر چلنے کی پوری پوری آزادی تھی، غیر مسلم اپنی عبادت اور اس کے طریقوں میں آزاد ہیں، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک عیسائی وفد کو خود مسجد نبوی کے ایک گوشہ میں اپنے طریقہ پر عبادت کی اجازت دی تھی، اس

سے بڑھ کر رواداری کی اور کیا مثال ہو سکتی ہے؟ مذہبی عبادت گاہوں کے احترام کا بھی اسلام نے پورا لحاظ رکھا ہے، شام اور بیت المقدس کا علاقہ جب فتح ہوا تو وہاں کتنے ہی چرچ تھے، جن کو مسلمانوں نے جوں کا توں باقی رکھا۔ خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبد العزیز اپنے گورنروں کو ہدایت فرمائی تھی کہ کوئی کلیسا یا آتش کدہ منہدم نہ کیا جائے، اسی طرح غیر مسلم بھائیوں کے جذبات بھی ملحوظ رکھنے کا حکم دیا تھا، اور وہ جن معبودانِ باطل کی پرستش کرتے ہوں، ان کو بھی بُرا بھلا کہنے کی ممانعت کی گئی، ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ (.........)

معاشرتی اور تمدنی قوانین میں بھی غیر مسلموں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی دی گئی، وہ جس چیز کے کھانے کو حلال سمجھتے ہوں، گو اسلام میں اس کا کھانا حرام ہو، لیکن ان کو اپنے مذہب کے مطابق کھانے پینے کی اجازت ہے، اس لئے غیر مسلموں کو شراب پینے اور آپس میں شراب و خنزیر کی تجارت کرنے کا حق حاصل ہوگا، جن خواتین کو قرآن نے محرم قرار دیا ہے، اور ان سے کسی قیمت پر نکاح کو روا نہیں رکھا ہے، اگر ان کے مذہب میں ان خواتین سے نکاح کی اجازت ہو، تو انہیں اپنے مذہب پر عمل کرنے کا حق حاصل ہوگا، یہی حال دوسرے سماجی و تہذیبی قوانین کا ہے۔

اگر مسلم ممالک میں کبھی غیر مسلم کو اپنے روایتی لباس اور پوشاک میں رہنے کا حکم دیا گیا ہے، تو اس کا مقصد ان کی تحقیر نہیں، بلکہ ان کی تہذیب کی حفاظت اور ان کے تشخص کو برقرار رکھنا ہے، اسلام چاہتا ہے کہ ہر قوم اپنے تمدن کو قائم رکھے، اسی لئے مسلمانوں کو بھی غیر مسلموں کی وضع اختیار کرنے اور ان کی تہذیب میں جذب ہونے سے منع فرمایا گیا تو اگر تاریخ میں کبھی ایسے واقعات پیش آئے ہوں، تو اس میں ان کی تحقیر و اہانت نہیں بلکہ ان کا تحفظ اور ان کی تہذیب کے بقا کا سروسامان ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اسلام نہ صرف عقیدہ و ایمان بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں اپنا تشخص چاہتا ہے، اور یہ بات کہ مسلمان اپنے وجود کو گم کر دیں، اسے کسی قیمت پر گوارا نہیں، لیکن اس کے ساتھ وہ دوسری قوموں کے تئیں حسنِ سلوک، رواداری، بقاء باہم کے

اصول پر ایک دوسرے کے بارے میں تحمل، عبادت اور سماجی قوانین میں اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی اور عدل کا داعی ہے، وہ دین محبت اور دین اخوت ہے اور اس نے پوری کائنات سے محبت کا درس دیا ہے، وہ انسان کو بحیثیت انسان قابلِ تکریم سمجھتا ہے اور تمام مخلوق کو اللہ کا کنبہ قرار دیتا ہے، رحمدلی اور عدل سے زیادہ اسے کوئی چیز محبوب نہیں اور ظلم سے بڑھ کر کوئی چیز اسے ناپسند نہیں۔

(۲۹/جون ۲۰۰۱)

غیر مسلموں سے تعلقات

موجودہ عالمی حالات کے پس منظر میں غیر مسلموں سے تعلقات کا مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے اور افسوس ہے کہ ہم اس مسئلہ پر محض سیاسی اور مادّی نقطۂ نظر سے غور کرتے رہے ہیں، حالانکہ جب ہم اسلام کو ایک ہمہ گیر اور جامع نظامِ حیات سمجھتے ہیں، تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اس مسئلہ پر بھی اسلامی نقطۂ نظر سے سوچیں اور دیکھیں کہ اس بارے میں حقیقی اسلامی تعلیمات کیا ہیں؟

پوری انسانیت ــــــ ایک کنبہ

اس سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ قرآن مجید کے ارشاد کے مطابق پوری انسانیت کا آغاز ایک ہی ہستی کے وجود سے ہوا ہے، خدا نے اسی ہستی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور اس جوڑے سے پوری انسانیت وجود پذیر ہوئی:

"يٰاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً ا." (النساء:۱)

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا ہے اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا ہے، نیز ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت کو وجود بخشا۔

اس طرح اسلام کی نظر میں پوری انسانیت ایک ہی کنبہ اور خاندان ہے، یہ ایک ہی درخت کی شاخیں اور ایک ہی گلدستہ کے پھول ہیں، اس سے ہمیں انسانی اخوت کا سبق ملتا ہے، جیسے ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، اسی طرح ہر انسان، انسانی رشتہ سے

ہمارا بھائی اور ہمارے وسیع تر خاندان اور کنبہ کا ایک حصہ ہے، یہ اخوت و بھائی چارگی ہمیں محبت و پیار کا پیغام دیتی ہے اور اس جانب متوجہ کرتی ہے کہ ہمیں ہر فرد و بشر سے محبت ہونی چاہیے۔

شرافتِ انسانی کا تصور

باہمی انسانی روابط کی دوسری بنیاد انسانی شرافت و کرامت اور احترامِ آدمیت ہے، انسان کو بحیثیتِ انسان اللہ تعالیٰ نے قابلِ احترام قرار دیا ہے:

"وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ." (بنی اسرائیل:۷۰)

اس کے جسمانی سانچہ کو بہترین سانچہ قرار دیا ہے:

"لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ." (التین:۴)

''ہم نے انسان کو بہترین قالب میں پیدا کیا ہے۔''

یہ تکریم و احترام تمام بنی نوعِ انسانی سے متعلق ہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی طور پر اس حقیقت کو واضح فرمایا، ایک بار ایک یہودی کا جنازہ جا رہا تھا، آپؐ کھڑے ہوگئے، لوگوں نے عرض کیا کہ یہ یہودی کا جنازہ ہے، آپؐ نے فرمایا کہ جان تو اس میں بھی ہے، (بخاری، حدیث نمبر:۱۳۱۲، باب من قام بجنازة یھودی) غزوۂ احزاب کے موقع سے ایک مشرک مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا، اہل مکہ نے خواہش کی کہ اس کی قیمت لے کر نعش ان کے حوالہ کردیں، تو آپؐ نے کوئی قیمت لیے بغیر نعش واپس کردی؛ کیوں کہ انسانی نعش کی قیمت وصول کرنا انسانی احترام کے مغائر ہے، اسلام سے پہلے جنگ کا کوئی قانون نہیں تھا اور لوگ مقتول کے اعضاء تراش کر ہار پہنتے اور اپنی آتش انتقام بجھاتے تھے، اسلام نے ایک تو حتی المقدور جنگ سے بچنے کا حکم دیا؛ لیکن اگر اس کی نوبت آہی جائے تو جنگ کے مہذب قوانین مقرر کیے، من جملہ ان کے یہ ہے کہ اگر کوئی شخص گرفت میں آجائے تو ایذاء پہنچا پہنچا کر قتل نہ کیا جائے اور جو مارے جائیں، ان کے اعضاء کاٹے نہ جائیں کہ یہ احترامِ انسانیت کے خلاف ہے۔

اسلام بحیثیتِ انسان کسی غیر مسلم کی توہین وتحقیر کو بھی رَوا نہیں رکھتا، بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ غیر مسلم کے لیے ''کافر'' اور ''ذمی'' کا لفظ استعمال کر کے ان کی تحقیر کی گئی ہے، اسی طرح آج کل بعض غیر مسلم بھائی ''کافر'' کے لفظ کو اہانت آمیز اور حقارت انگیز خیال کرتے ہیں، یہ محض غلط فہمی اور پروپیگنڈہ ہے، ''کفر'' کے معنی انکار کے ہیں، قرآن مجید میں یہ لفظ انکار ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے، چنانچہ منکرین آخرت کے بارے میں ارشاد ہوا: ''وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كَافِرُوْنَ'' (یوسف: ۳۷) اہل مکہ کو ان باتوں سے انکار تھا، جس کی دعوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیا کرتے تھے؛ اس لیے وہ کہتے تھے: ''اِنَّا بِمَا اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كَافِرُوْنَ'' (الزخرف: ۲۴) یعنی: ''آپ جس دین کو لے کر بھیجے گئے، ہیں ہم اس کا انکار کرتے ہیں،'' اسی طرح جادو کے انکار پر بھی کفر کا اطلاق کیا گیا ہے، چنانچہ بعض انبیاء علیہم السلام کے مخالفین کا قول نقل گیا ہے: "قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّ اِنَّا بِهٖ كَافِرُوْنَ"(الزخرف: ۳۰)

پس ''کافر'' کے معنی انکار کرنے والے، یعنی ایسے شخص کے ہیں، جو توحید اور اسلامی تعلیمات کو قبول نہیں کرتا ہو، گویا یہ غیر مسلم "Non Muslim" کا ہم معنی لفظ ہے، پس یہ ایک حقیقت کا اظہار ہے نہ کہ کسی شخص کی توہین، اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں متعدد مواقع پر اس عہد کے غیر مسلموں کو'' کافر'' کے لفظ سے مخاطب کیا گیا، لیکن انہوں نے اس کا برا نہیں مانا، اگر یہ لفظ اہانت آمیز ہوتا تو یقیناً انہوں نے اس طرزِ تخاطب پر اعتراض کیا ہوتا، پھر باوجودیکہ یہ لفظ اہانت آمیز نہیں ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی کو 'اے کافر' کہنے سے ایذاء ہوتی ہو، تو اس شخص کو اس طرح خطاب نہ کیا جائے اور اگر کرے گا، تو گنہگار ہوگا:

ولو قال لذمي يا كافر! يأثم ان شق عليه .(الأشباه والنظائر : ۲۵۷/۲)

اگر کسی نے کسی ذمی کو اے کافر کہہ کر پکارا اور اس پر یہ گراں گذرتا ہو تو اے کافر کہنے والا شخص گناہ گار ہوگا۔

ذمی کا لفظ اہانت آمیز نہیں

اسی طرح عربی زبان میں ''ذمہ'' کے معنی ''عہد'' کے ہیں، ''ذمی'' اس شخص کو کہا جاتا ہے، جس کی حفاظت کا عہد کیا جائے، چنانچہ عربی زبان کی مشہور لغت ''لسان العرب'' میں ہے:

''رجل ذمی ، معناہ لہ عهد .'' (لسان العرب:۵/۵۹) .

مردِ ذمی کے معنی ایسے شخص کے ہیں، جس کے لیے عہد کیا گیا ہو۔

اسی طرح علامہ ابن اثیرؒ اس بات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ غیر مسلم اقلیت کو اہل ذمہ کیوں کہا جاتا ہے؟ رقمطراز ہیں:

سمی أهل الذمة لدخولهم في عهد المسلمين و أمانهم .

(النہایۃ:۲/۱۶۸)

''اہل ذمہ اس لیے نام رکھا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے عہد اور ان کی امان میں داخل ہو جاتے ہیں۔''

اس لیے یہ محض غلط فہمی ہے کہ قرآن مجید اور حدیثِ نبویؐ میں غیر مسلموں کے لیے اہانت آمیز تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

جہاں تک مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلقات کی بات ہے تو اس موضوع کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: سماجی تعلقات، معاشی تعلقات، سیاسی تعلقات اور مذہبی تعلقات، تعلقات کے ان تمام دائروں کے سلسلے میں قرآن وحدیث سے ہمیں تفصیلی رہنمائی ملتی ہے:

سماجی تعلقات

سماجی تعلقات کے سلسلہ میں بنیاد اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ ، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ

الْمُقْسِطِيْنَ . (الممتحنۃ:۸)

جو لوگ تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کرتے اور نہ انہوں نے تم کو تمہارے گھر سے نکالا ہے، اللہ تعالیٰ تم کو ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور انصاف برتنے سے نہیں روکتے، بیشک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔

غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک

یہ آیت بنیادی اہمیت کی حامل ہے اور اس سے یہ بات واضح ہے کہ جو غیر مسلم مسلمانوں سے برسرِ پیکار نہ ہوں، مسلمانوں پر ان کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرنا ضروری ہے، قرآن نے صاف کہا ہے کہ کسی قوم کا ہدایت کے راستہ پر آنا اور دین حق کو قبول کرنا اللہ تعالیٰ کی توفیق پر منحصر ہے، لیکن اس کی وجہ سے کسی گروہ کے ساتھ بے تعلقی کا معاملہ کرنا اور حسن سلوک سے رک جانا درست نہیں، مسلمان ان کے ساتھ جو بہتر سلوک کریں گے، انہیں بہرحال اس کا اجر مل کر رہے گا:

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ ، وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ، وَ مَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ ، وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ . (البقرۃ:۲۷۲)

ان لوگوں کی ہدایت آپ کے ذمہ نہیں ہے، اللہ جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں اور تم جو کچھ مال خرچ کرتے ہو، وہ اپنے ہی لیے اور خرچ نہیں کرتے ہو مگر اللہ کی خوشنودی کی تلاش میں، اور جو بھی خرچ کرو گے تم کو پورا پورا دیا جائے گا، (یعنی اس کا اجر ملے گا) اور تم پر ظلم نہیں ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بعض انصار کی بنو قریظہ اور بنو نضیر کے یہودیوں سے قرابت تھی، انصار ان پر اس لیے صدقہ نہیں کیا کرتے تھے کہ جب ضرورت مند ہوں گے تو اسلام قبول کریں گے، (تفسیر قرطبی:۳/۳۳۷) اللہ تعالیٰ نے ان کے

اس رویہ کو پسند نہیں کیا اور فرمایا: ان کی ہدایت کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے؛ لیکن تم کو اس کی وجہ سے اپنا دستِ تعاون نہ کھینچنا چاہیے؛ کیوں کہ تم کو تمہارے انفاق کا اجر مل کر رہے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے رفقاءؓ نے عملی طور پر اس کو برت کر دکھایا، مکہ میں شدید قحط پڑا، لوگ مردار وغیرہ کھانے پر مجبور ہو گئے، یہ زمانہ مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان شدید اختلاف اور گرما گرمی کا تھا، اس کے باوجود آپؐ نے مکہ کے قحط زدہ مشرکین کے لیے پانچ سو دینار بھیجے؛ حالانکہ اس وقت خود مدینہ کے مسلمان سخت مالی دقتوں اور فاقہ مستیوں سے دوچار تھے، نیز آپؐ نے یہ رقم سردارانِ قریش ابوسفیان اور صفوان بن امیہ کو بھیجی، جو مسلمانوں کی مخالفت میں پیش پیش تھے اور مشرکین مکہ کی قیادت کر رہے تھے۔ (ردّ المحتار: ۳۰۲/۳، باب المصرف)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بوڑھے غیر مسلم کو دیکھا کہ وہ بھیک مانگ رہا ہے، جب حضرت عمرؓ نے وجہ پوچھی تو کہا کہ ہمیں جزیہ ادا کرنا ہے، حضرت عمرؓ نے بیت المال سے اس کا وظیفہ مقرر فرمایا اور کہا ہم نے تمہاری جوانی کو کھایا اور اب پھر تم سے جزیہ وصول کریں، یہ انصاف کی بات نہیں ہے، "ما انصفناك أكلنا شيبتك، ثم نأخذ منك الجزية" (نصب الرایہ: ۴۵۴/۳) چنانچہ فقہاء کے یہاں اس پر تو قریب قریب اتفاق ہے کہ صدقاتِ نافلہ غیر مسلموں کو دیا جاسکتا ہے، حنفیہ کے نزدیک راجح یہ ہے کہ زکوۃ کے علاوہ دوسرے صدقاتِ واجبہ بھی غیر مسلموں کو دیے جاسکتے ہیں، (دیکھئے الدر المختار علی ہامش رد المحتار: ۳۰۱/۳)

انسانی زندگی کا احترام وتحفظ

سماجی زندگی میں سب سے اہم مسئلہ امن وامان کا ہے اور امن وامان کا تعلق جان و مال اور عزت وآبرو سے ہے، چنانچہ شریعتِ اسلامی میں غیر مسلموں کی جان و مال اور عزت وآبرو کو وہی اہمیت دی گئی ہے، جو مسلمانوں کی جان و مال اور عزت وآبرو کو دی گئی ہے، اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اصولی بات ارشاد فرمائی ہے کہ ان کے خون ہمارے خون کی طرح اور ان کے مال ہمارے مال کی طرح ہیں:

دِمَائُهُمْ كَدِمَائِنَا ، وَ أَمْوَالُهُمْ كَأَمْوَالِنَا. (نصب الرایۃ:۴/۳۶۹)
چنانچہ قرآن مجید نے مطلق نفس انسانی کے قتل سے منع کیا ہے، ارشاد ہے:
لَا تَقْتُلُوْا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ . (بنی اسرائیل:۳۳)
کسی نفس کو جس کے قتل کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے، ناحق قتل نہ کرو۔
ایک اور موقع پر کسی معقول سبب کے بغیر ایک شخص کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا گیا:
مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا . (المائدہ:۳۲)
جس نے کسی نفس انسانی کو کسی دوسرے کے بدلے یا زمین میں فساد کے بغیر قتل کیا تو گویا اس نے پوری انسانیت کو قتل کر دیا۔
کیوں کہ اگر کوئی شخص ایک بے قصور شخص کو قتل کر سکتا ہے تو وہ انسانیت کے کسی بھی شخص کو قتل و غارت گری کا نشانہ بنا سکتا ہے؛ اس لیے گویا وہ پوری انسانیت کا قاتل ہے، ان آیات میں مسلمان اور غیر مسلم کی کوئی قید نہیں ہے؛ بلکہ مطلقاً کسی بھی انسان کے قتل کو منع فرمایا گیا ہے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہیں غیر مسلم ___ جس سے امن اور بقاءِ باہم کا معاہدہ ہو ___ کے قاتل کے بارے میں فرمایا، کہ وہ جنت کی بو سے بھی محروم رہے گا:
مَنْ قَتَلَ مُعَاهِدًا لَمْ يَرِحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ ، وَ اِنَّ رِيْحَهَا يُوْجَدُ مِنْ مَسِيْرَةِ اَرْبَعِيْنَ عَامًا . (بخاری عن عبداللہ بن عمروؓ، حدیث نمبر:۳۱۶۶)
جس نے کسی معاہد (وہ غیر مسلم جس سے پُر امن زندگی گزارنے کا معاہدہ ہو) کو قتل کیا، وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا؛ حالانکہ اس کی بو چالیس سال کے فاصلہ سے محسوس کی جاسکتی ہے۔
اگر کوئی مسلمان غیر مسلم کو قتل کر دے تو مسلمانوں کو بھی اس کے قصاص میں قتل کر دیا جائے گا؛ کیوں کہ قرآن مجید نے علی الاطلاق قصاص کا یہی اصول بتلایا ہے، جو شخص دوسرے

شخص کا قاتل ہو، وہ اس کے بدلے قتل کیا جائے گا: ''اَلنَّفْسُ بِالنَّفْسِ'' (المائدہ:۴۵) اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک غیر مسلم (ذمی) کے قصاص میں ایک مسلمان کو قتل کیا گیا، (مصنف عبدالرزاق: ۱۰/۱۰۱) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے ''ذمی'' کے بدلے مسلمان کے قتل کا حکم دیا، (مصنف عبدالرزّاق: ۱۰/۱۰۱) امام شافعیؒ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی نقل کیا ہے کہ انہوں نے بعض اہل ذمہ کو قتل کرنے والے مسلمانوں کو قتل کرنے کا حکم فرمایا۔

(مسندِ امام شافعی، السنن البیہقی: ۱۲/۴۳)

اگر مقتول کے ورثاء سزاءِ قید کو معاف کردیں، یا قتل کے واقعہ میں قصد و ارادہ کو دخل نہ ہو؛ بلکہ غلطی سے قتل کا ارتکاب ہوا ہو تو ان صورتوں میں قصاص کے بدلہ خون بہا (دیت) واجب ہوتا ہے، چنانچہ خون بہا بھی مسلمان اور غیر مسلم کا یکساں ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ ؐ نے غیر مسلم کی دیت مسلمان ہی کی طرح ادا کی، (سنن دار قطنی، کتاب الحدود) حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت ابو ہریرہ، حضرت اسامہ بن زید اور مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ مسلمان اور غیر مسلم کی دیت برابر ہوگی، علامہ زیلعیؒ نے تفصیل سے ان روایتوں کو نقل فرمایا ہے۔

(دیکھئے: نصب الرایہ: ۴/ ۶۸-۳۶۹) (جاری)

املاک کا احترام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اصول مقرر فرمایا کہ غیر مسلموں کی جانیں مسلمانوں کے جانوں کی طرح ہیں اور ان کے مال مسلمانوں کے مالوں کی طرح ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کی املاک بھی اسی طرح قابل احترام ہیں جیسا کہ مسلمانوں کی، بغیر رضامندی کے نہ کسی مسلمان کا مال لیا جاسکتا ہے نہ کسی غیر مسلم کا ''اِلَّا اَنْ تَکُوْنَ

تَجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ'' (النساء:۲۹)

فتح خیبر کے موقع سے بعض مسلمان فوجیوں نے یہودیوں کے جانور ذبح کردیے اور کچھ پھل کھالیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو آپؐ نے اس موقع پر خطاب کیا، اس عمل پر ناگواری ظاہر کی اور فرمایا کہ یہ تمہارے لیے حلال نہیں ہے۔ (ابوداؤد ،حدیث نمبر: ۳۰۵۰)

متعدد صحابہؓ سے آپ کا یہ ارشاد منقول ہے:

أَلَا مَنْ ظَلَمَ مُعَاهِدًا أَوْ انْتَقَصَهُ أَوْ كَلَّفَهُ فَوْقَ طَاقَتِهِ أَوْ أَخَذَ مِنْهُ شَيْئًا بِغَيْرِ طِيبِ نَفْسٍ ، فَأَنَا حَجِيجُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ .

(ابوداؤد، حدیث نمبر:۳۰۵۳)

آگاہ ہوجاؤ! جس نے کسی معاہد پر ظلم کیا، اس کی حق تلفی کی یا اسے اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف کیا یا اس سے کوئی چیز اس کی رضامندی کے بغیر لے لی، تو میں قیامت کے دن اس کا فریق ہوں گا۔

اسلامی قانون کی رو سے چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے، جیسے مسلمان کا مال چوری کرنے میں ہاتھ کاٹا جائے گا، اسی طرح اگر کوئی مسلمان چور غیر مسلم کا مال چوری کرلے تو اس صورت میں بھی اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا، علامہ ابن قدامہ مقدسیؒ نے یہ لکھتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ یہ مسئلہ فقہاء کے یہاں متفق علیہ ہے، (المغنی لابن قدامہ:۱۲/۴۵۱، مع تحقیق: عبداللہ بن عبدالحسن وغیرہ) اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی نظر میں مسلمان اور غیر مسلم کی ملکیت یکساں قابل احترام ہے۔

عزت وآبرو کی حفاظت

یہی معاملہ عزت وآبرو اور عفت وعصمت کی حفاظت کا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا تفریق مذہب ہر بڑے کی توقیر کا حکم دیا ہے اور ہر چھوٹے پر شفقت اور محبت کی تلقین کی ہے، مؤمنوں سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّن نِّسَاءٍ عَسَىٰ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ ۔ (الحجرات:۱۱)

اے ایمان والو! ایک گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے، ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہو اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا تمسخر کریں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہو، نہ ایک دوسرے پر طعن کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب دو۔

اسی طرح مردوں سے فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنی نگاہوں اور شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور یہی حکم مسلمان عورتوں کو بھی دیا گیا، (النور: ۳۱) یہ حکم مطلق ہے اور اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی تفریق نہیں، معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کی عزت و آبرو کی بھی وہی اہمیت ہے، جو مسلمانوں کی ہے، عفت و عصمت کو مجروح کرنے والی چیزیں حرام ہیں، خواہ مسلمانوں کے ساتھ کی جائیں یا غیر مسلموں کے ساتھ، مطلقاً حرام ہیں، جو سزا کسی مسلمان عورت کی آبروریزی کی ہے، وہی سزا غیر مسلم عورت کی آبروریزی کی بھی ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ عزت و آبرو کی حفاظت کا وہی حق مسلم ریاست میں آباد غیر مسلم باشندوں کو حاصل ہے، جو مسلمانوں کو حاصل ہے۔

خوشی وغم میں شرکت

سماجی تعلقات کے دائرہ میں کھانا، کھلانا، پڑھنا، پڑھانا، باہمی ملاقات، خوشی وغم کے موقع پر دلداری وغیرہ امور بھی آتے ہیں، اسلام نے ان تمام شعبوں میں غیر مسلموں کے ساتھ بھی خوش گوار برتاؤ کا حکم دیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں کی دعوت قبول فرمائی ہے، (صحیح بخاری، حدیث نمبر ۲۶۱۷ باب قبول الهدیۃ من المشرکین) خود غیر مسلموں کو دعوت دی ہے (الدر المنثور: ۱۸۱/۵) انہیں اپنا مہمان بنایا ہے (الخصائص الکبریٰ: ۱۲۳/۱) اپنے رفقاء کو غیر مسلم بزرگوں کی تجہیز و تکفین کے انتظام کا حکم دیا ہے (اعلاء السنن: ۲۸۲/۸ باب ما یفعل المسلم اذا مات لہ قریب کافر) نیز غیر مسلموں کی عیادت کی ہے،

(صحیح البخاری، حدیث نمبر ۵۶۵۷ باب عیادۃ المشرک)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں فقہاء نے غیر مسلموں سے متعلق جو احکام دیے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

☆ مجوسی کا ہر قسم کا کھانا جائز ہے، سوائے ذبیحہ کے۔

☆ مسلمان اور مشرک رشتہ دار کے ساتھ صلہ رحمی کرنا درست ہے، وہ نزدیک کا ہو یا دور کا اور ذمی ہو یا حربی، حربی سے مراد وہ شخص ہے، جو دشمن ملک کا شہری ہو۔

☆ مسلمانوں کے لیے عیسائی پڑوسی سے مصافحہ کرنا درست ہے۔

☆ یہودی اور عیسائی کی عیادت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

☆ جب کسی غیر مسلم کی وفات ہوجائے تو اس کے عزیز سے عیادت کے لیے یہ الفاظ کہے جائیں:

اَخْلَفَ اللّٰہُ خَیْرًا مِّنْہُ وَ اَصْلَحَكَ. (ہندیہ: ۵/۳۸۴)

اللہ تجھ کو اس کا نعم البدل عطا فرمائے اور تمہاری حالت کو بہتر کرے۔

تعلیم و تعلم کا تعلق

غیر مسلموں سے تعلیم و تعلم بھی درست ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''علم و حکمت مؤمن کی متاعِ گم شدہ ہے،'' ''اَلْحِکْمَۃُ ضَالَّۃُ الْمُؤْمِنِ'' (ترمذی، عن ابی ہریرۃؓ، حدیث نمبر: ۲۶۸۷) چنانچہ جنگ بدر کے قیدیوں میں جو لوگ پڑھنے لکھنے سے واقف تھے، آپؐ نے ان کا فدیہ یہی مقرر کیا تھا کہ وہ دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھادیں، اسی لیے تعلیم و تعلم کے مقدس رشتہ میں مذہب کی بنیاد پر کوئی تفریق روا نہیں رکھی گئی ہے۔

البتہ سماجی تعلقات میں اس بات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ اسلام نے وضع قطع، رسم و رواج وغیرہ میں اس بات کو پسند کیا ہے کہ مسلمان اپنی شناخت کو باقی رکھیں اور اپنے تہذیبی تشخص کو کھو نہیں دیں، چنانچہ آپؐ نے فرمایا کہ:

لَیْسَ مِنَّا مَنْ تَشَبَّہَ بِغَیْرِنَا. (الجامع للترمذی، حدیث نمبر: ۲۶۹۵)

جو دوسروں کی مماثلت اور مشابہت اختیار کرے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

اسی لیے آپؐ نے سلام کے طریقہ، داڑھی اور سر کے بال کی وضع وغیرہ میں اس بات کو پسند نہیں کیا ہے کہ مسلمان اپنے امتیاز کو کھودیں۔

معاشی تعلقات

معاشی تعلقات کے معاملہ میں بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کوئی تفریق نہیں، نبوت کے بعد بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ابوسفیان اور جبیر بن مطعم کے ساتھ مضاربت کرنا منقول ہے، اسی طرح خیبر کے فتح ہونے کے بعد آپؐ نے وہاں کی اراضی یہودیوں کے قبضہ میں ہی رہنے دیں اور ان سے بٹائی پر معاملہ طے کرلیا، جس کا بخاری اور مختلف کتبِ احادیث میں ذکر موجود ہے، (صحیح البخاری، حدیث نمبر ۲۲۴۸ باب معاملة النبی علی اهل خیبر) مسلمانوں کے لیے یہ بات درست ہے کہ وہ کسی غیر مسلم کے یہاں ملازمت کریں، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی کے یہاں مزدوری کی ہے، کتبِ احادیث میں اس کا ذکر موجود ہے، (کنز العمال: ۲/۳۲۱) حضرت خباب رضی اللہ عنہ لوہاری کے فن سے واقف تھے، انہوں نے عاص بن وائل کے لیے کام کیا، اس کا ذکر بھی احادیث میں موجود ہے، "خباب کان قینا فعل للعاص بن وائل"
(بخاری، حدیث نمبر: ۲۲۷۵، مسلم، حدیث نمبر: ۷۰۶۲)

اسی طرح یہ بات بھی درست ہے کہ مسلمان غیر مسلموں کو اپنے یہاں ملازمت کا موقع دیں، عرب میں سڑکوں کا کوئی باضابطہ نظام نہیں تھا اور پورا خطہ عرب ریت سے ڈھکا ہوا تھا، اسی لیے راستہ کی شناخت دشوار ہوتی تھی اور جن لوگوں کو شناخت نہیں ہوتی تھی، وہ سفر میں کسی راہ بتانے والے کو ساتھ لے جاتے تھے، ان کو "دلیل" کہا جاتا تھا، جس کے معنی راہبر کے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو ایک مشرک کو اپنے لیے بطورِ 'دلیل' اجرت دے کر ساتھ رکھا، (احکام أہل الذمۃ لابن قیم: ۲۰۷) اسی لیے فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ مسلمان غیر مسلم کو اپنے یہاں ملازم

رکھ سکتے ہیں: یجوز أن یکون الأجیر ذمیا و المستأجر مسلما بلاخوف

(الموسوعۃ الفقہیۃ: ۵:۱۰۵، مادہ: اجارہ)

چنانچہ مسلم عہدِ حکومت میں غیر مسلم حضرات بڑے اونچے اور کلیدی عہدوں پر فائز رہے ہیں، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں حمص کا فینانشیل کمشنر اور حاکم ابن اَثال نامی ایک عیسائی تھا، عبدالملک بن مروان کا کاتب ابن سرجون تھا، یہ بھی عیسائی تھا، کاتب کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اسی سے فرامینِ سلطنت کی مراسلت متعلق تھی اور بقول علامہ شبلیؒ وہ وزیر اعظم کے برابر یا اس سے دوسرے درجہ پر خیال کیا جاتا تھا، عباسی دور میں ابواسحاق صابی اس منصب پر فائز تھا، سلطنت ویلم کے تاجدار عضد الدولہ جیسے عظیم فرمانروا کا وزیر اعظم بھی ایک عیسائی تھا، جس کا نام نصر بن ہارون تھا، یہ تمام فرمانروا نہ صرف اپنی طاقت و حکمرانی میں ممتاز تھے؛ بلکہ مذہب سے بھی ان کا خاص تعلق تھا؛ لیکن ان کی مذہبیت غیر مسلم بھائیوں سے سلطنت کے اہم اور کلیدی شعبوں میں خدمت لینے میں حارج نہیں ہوئی۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے مقالاتِ شبلی: ۲/ ۲۱۷-۲۱۹)

سیاسی تعلقات

انسان جس خطہ میں رہتا ہو، وہاں کے سیاسی حالات سے بے تعلق نہیں رہ سکتا، کیوں کہ سیاسی مدوجزر اور اتار چڑھاؤ کا اثر زندگی کے تمام شعبوں پر پڑتا ہے اور بڑی حد تک سماج کا امن و امان بھی ان حالات سے متعلق ہوتا ہے، چنانچہ اسلام میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سیاسی روابط کی گنجائش رکھی گئی ہے، سیاست کا مقصد ملک میں قانون کی حکمرانی کو قائم رکھنا اور مستحکم بنانا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اس دنیا میں تشریف لائے، اس وقت حجاز کے علاقہ میں کوئی باضابطہ حکومت موجود نہیں تھی؛ البتہ قبائلی روایات اور دستور کے مطابق تحفظ ہوا کرتا تھا اور لوگوں کے باہمی تعلقات قائم رہتے تھے۔

سیاسی اشتراک

اسی زمانہ میں مکہ میں ایک واقعہ پیش آیا کہ مکہ کے ایک شخص نے ایک بیرونی شخص کا

حق ادا کرنے سے انکار کردیا، چوں کہ اس کا تعلق مکہ سے نہیں تھا اور مکہ میں اس کے ہم قبیلہ لوگ بھی نہیں تھے۔ اس لیے ممکن نہ تھا کہ وہ بزورِ طاقت اپنا حق حاصل کر سکے، اس غریب الوطن شخص نے صحن کعبہ میں اہل مکہ کو اپنی بپتا سنائی اور ان کے ضمیر سے انصاف کے طلب گار ہوئے، اس موقع سے کچھ لوگ اس کی مدد کے لیے کھڑے ہوئے اور عبداللہ بن جدعان کے مکان پر اس کی نشست ہوئی، اس میں آپؐ نے بھی پوری سرگرمی سے شرکت کی اور اس طرح ''حلف الفضول'' نامی ایک تنظیم قائم ہوئی، جس کا مقصد انصاف کو قائم کرنا، ظلم کو روکنا اور ظالم کے خلاف مزاحمت کرنا تھا، یہ واقعہ نبوت سے پہلے کا تھا؛ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کام اس قدر پسند آیا تھا کہ آپؐ نے فرمایا کہ اگر مجھے آج بھی اس کی طرف بلایا گیا تو میں اس پر لبیک کہوں گا: ''لَوْ اُدْعِیْ بِہٖ فِی الْاِسْلَامِ لَاَجَبْتُ''

(البدایۃ والنہایۃ: ۲؍۲۹۱)

بنو امیہ کے دور میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کے درمیان ایک مسئلہ پر نزاع پیدا ہوگئی، جس میں ولید کی زیادتی تھی، حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کے درمیان ایک مسئلہ پر نزاع پیدا ہوگئی، جس میں ولید کی زیادتی تھی، حضرت حسینؓ نے اس سلسلہ میں اسی حوالہ سے لوگوں کی مدد چاہی، یکے بعد دیگرے کئی صحابہؓ نے اس پر لبیک کہا، بالآخر ولید کو اپنے ارادہ سے باز آنا پڑا، (سیرت ابن ہشام: ۱؍۱۳۵) یہ واقعہ اس بات کے لیے بنیاد فراہم کرتا ہے کہ سیاسی جدوجہد میں مسلمان اور غیر مسلم ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک کر سکتے ہیں اور سیاسی تعلقات میں اصولوں کی بنیاد پر غیر مسلموں کا تعاون کیا جاسکتا اور ان سے تعاون لیا جاسکتا ہے، نیز ایسی سیاسی تنظیموں میں جو خالص مسلم تنظیم نہ ہو، مسلمان شریک ہو سکتے ہیں۔

قرآن مجید نے حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ تفصیل سے ذکر کیا ہے، مصر میں اس وقت مشرکین ہی کی حکومت تھی، حضرت یوسف علیہ السلام نے ملکی مفادات اور مصالح کو سامنے رکھتے ہوئے وزارتِ خزانہ طلب فرمائی: ''قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَائِنِ الْاَرْضِ'' (یوسف: ۵۵) حضرت یوسف علیہ السلام کی خواہش قبول کی گئی اور انہوں نے

اس فریضہ کو بہت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا، اس سے معلوم ہوا کہ ایسے اقتدار میں شریک وسہیم ہونا بھی درست ہے، جس میں غیر مسلموں کو غلبہ حاصل ہو۔

مبنی بر انصاف قوانین کی اطاعت

غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے سیاسی تعلقات دو اصولوں پر مبنی ہوں گے، اوّل ان قوانین کی اطاعت پر، جو مبنی بر انصاف ہو؛ کیوں کہ آپ جس ملک کی شہریت قبول کرتے ہیں، تو یہ زبانِ حال سے اس ملک کے دستور کی پاسداری اور فرمانبرداری کا اقرار ہے اور ایک طرح کا عہد، جو ہم نے ملک کے ساتھ کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ عہد کو پورا کرو: ''اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ'' (المائدۃ:۱) ایک اور موقع پر فرمایا گیا: ''اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ'' (الاسراء:۳۴) یعنی معاہدات اور وعدوں کی پاسداری کرو، قانون شکنی کو اسلام جائز نہیں قرار دیتا؛ بشرطیکہ وہ صریحاً عدل کے خلاف نہ ہوں۔

ظلم کی مخالفت

سیاسی اشتراک کی دوسری بنیاد ظلم کی مخالفت اور اس کے سدّ باب میں باہمی تعاون ہے، قرآن مجید میں متعدد مقامات پر منکر کو روکنے کا حکم دیا گیا ہے، ''منکر'' میں تمام برائیاں شامل ہیں اور یقیناً ظلم بھی اس میں داخل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منکر کو روکنے کے طریقہ کے سلسلہ میں یہ اصول بتایا کہ اس کے لیے قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے طاقت کا استعمال کرسکتا ہو تو اس کا استعمال کرے، اگر طاقت کا استعمال نہیں کرسکتا تو زبان سے اس کے خلاف احتجاج کرے اور اگر زبان کے استعمال سے بھی عاجز ہے تو دل سے اس کو برا مانے اور عزم رکھے کہ جب بھی ممکن ہوگا، وہ ظلم کو دفع کرنے کی کوشش کرے گا۔

مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ ، وَ مَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ ،
وَ مَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ ، وَ ذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ .

(مسلم حدیث نمبر:۴۹)

تم میں سے جو شخص کسی برائی کو دیکھے تو چاہیے کہ بزورِ بازو اسے بدلنے کی کوشش کرے، اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے روکے اور اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو دل سے برا سمجھے اور یہ ایمان کا کمتر درجہ ہے۔

''ید'' ایک علامتی لفظ ہے اور ہاتھ سے مراد طاقت ہے، اس زمانہ میں ووٹ اور پرامن احتجاج بھی ایک طاقت ہے، اسی طرح زبان سے منکر کو روکنے میں زبان کے ذریعہ ظلم کے خلاف احتجاج بھی شامل ہے؛ اسی لیے قرآن مجید نے بری بات کو زبان پر لانے اور علی الاعلان کہنے کو منع کیا ہے، لیکن ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی اجازت دی ہے:

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ. (النساء:۱۴۸)

اللہ تعالیٰ بری بات کے زور سے کہنے کو پسند نہیں کرتے، سوائے اس کے کہ وہ مظلوم ہو۔

حدیث میں احتجاج کے بعض اور طریقے بھی منقول ہیں۔

(مجمع الزوائد:۸/۱۲۰، باب ماجاء فی أذی الجاری)

غرض کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سیاسی اشتراک درست ہے، البتہ سیاسی اشتراک خود مسلمانوں کا باہمی طور پر ہو یا مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ہو، اس کا مقصد صرف اقتدار میں ساجھے داری نہ ہو؛ بلکہ انصاف کو قائم کرنا اور ظلم کو روکنا مقصود ہو۔

مذہبی تعلقات

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کے سلسلہ میں سب سے اہم موضوع مذہبی تعلقات کا ہے، اس سلسلہ میں اسلامی تعلیمات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کے معاملہ میں دو باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں: اپنے دین پر استقامت اور دوسروں کے مذہبی جذبات کا احترام، ان دونوں نکات کی کسی قدر وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

شریعت اسلامی پر عمل

مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں، مسلم ممالک میں یا غیر مسلم ممالک میں، دین کے چار شعبوں میں ان کے لیے قانونِ شریعت کا التزام ضروری ہے، اعتقادات، عبادات، احوالِ شخصیہ اور معاملات۔

اعتقادات سے مراد وہ احکام ہیں، جن کا تعلق قلب وضمیر سے ہو، جیسے توحید، رسالت، آخرت کا یقین وغیرہ۔

''عبادات'' سے وہ احکام مراد ہیں، جن کا تعلق براہِ راست خدا اور بندے کے باہمی ارتباط سے ہے، جیسے: نماز، روزہ وغیرہ۔

''احوالِ شخصیہ'' سے مراد Parasnal Law ہے، اس میں نکاح، طلاق کے علاوہ میراث، وصیت اور مختلف اقارب سے متعلق حقوق وفرائض بھی آجاتے ہیں۔

''معاملات'' سے مراد مالی بنیاد پر دو افراد کے تعلقات ومعاہدات ہیں: تجارت، اجارہ، ہبہ وغیرہ اس شعبہ کے تحت آتے ہیں اور سود وقمار جیسے حرام معاملات بھی اسی دائرہ میں ہیں۔

یہ تمام قوانین وہ ہیں کہ چاہے مسلم اکثریت ملک ہو یا غیر مسلم اکثریت ملک، اور کلیدِ اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ ہو یا نہیں ہو، مسلمانوں کے لیے ان قوانین میں شریعتِ اسلامی کی اطاعت واجب ہے، جو قوانین اجتماعی نوعیت کے ہوں، یا جرم وسزا سے متعلق ہوں، جیسے حدود، قصاص، نظامِ مملکت وغیرہ، ان شعبوں سے متعلق شرعی قوانین وہیں قابلِ نفاذ ہیں، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور باگِ اقتدار ان کے ہاتھوں میں ہو، پس غیر مسلموں سے تعلقات ان قوانین پر عمل آوری کے حق سے دست برداری اور محرومی کی قیمت پر استوار نہیں کیے جاسکتے اور اس سلسلہ میں کسی تبدیلی کو قبول کرنے کا مطالبہ فی نفسہٖ نامعقول بھی ہے؛ کیوں کہ مسلمانوں کے ان پر عمل کرنے اور نہ کرنے سے غیر مسلم بھائیوں کو نہ کوئی فائدہ ہے اور نہ کوئی نقصان۔

اپنی شناخت کی حفاظت

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ اسلام مسلمانوں سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ تہذیبی اور تمدنی اعتبار سے اپنے وجود کو دوسروں کے ساتھ گم نہ کرلیں، بلکہ اپنی شناخت اور پہچان کو باقی رکھیں، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری اقوام کی مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

لَيْسَ مِنَّا مَنْ تَشَبَّهَ بِغَيْرِنَا ، لَا تُشَبِّهُوا بِالْيَهُوْدِ وَ لَا بِالنَّصَارٰى الخ

(الجامع للترمذی، حدیث نمبر: ۲۶۹۵، کتاب الاستیذان)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو دوسروں کی مشابہت اختیار کرے وہ ہم میں سے نہیں، یہودیوں اور عیسائیوں سے مماثلت اختیار نہ کرو۔

اس تشبہ اور مماثلت کے چار مدارج ہو سکتے ہیں:

(الف) دوسری قوموں کے مذہبی شعائر میں مماثلت اختیار کی جائے، جیسے مسلمان صلیب یا زنار پہننے لگیں، یا سکھوں کے جو مخصوص شعائر ہیں، ان کو استعمال کریں ___ فقہاء نے اسے باعثِ کفر قرار دیا ہے، مجوسی خاص قسم کی ٹوپی پہنا کرتے تھے، فقہاء نے اس پر کفر کا حکم لگایا ہے: وَ لَوْ وَضَعَ عَلٰى رَأْسِهٖ قَلَنْسُوَةَ الْمَجُوْسِ كَفَرَ۔

(الملتقط فی الفتاوی الحنفیۃ: ۲۴۵)

اسی طرح فقہاء کے یہاں زنار کے بارے میں بھی صراحت ملتی ہے، ہندوستان میں قشقہ لگانے کا حکم بھی یہی ہے؛ کیوں کہ وہ ہندو بھائیوں کے مذہبی شعائر میں سے ہے۔

(ب) غیر مسلم مذہبی تہواروں میں شرکت؛ یہ اگر یوں ہی ہو یا اس کا مقصد اپنے گمان کے مطابق رواداری ہو، تو حرام ہے اور اگر ان کے مذہبی معتقدات اور افعال پر خوشنودی و رضامندی کا اظہار اور تائید و تحسین مقصود ہو، تو کفر ہے: ''إِنَّمَا الرِّضَا بِالْكُفْرِ مُسْتَحْسِنًا كُفْرٌ۔'' (الملتقط: ۲۴۵) کیوں کہ آدمی، جس مذہب پر عقیدہ نہ رکھتا ہو اور اپنے عقیدہ کے مطابق اس کو نادرست خیال کرتا ہو، اس میں شرکت اور اس پر رضامندی و خوشنودی کا اظہار کھلی ہوئی دوعملی اور نفاق کی بات ہے؛ اس لیے اسلام نہ مسلمانوں کے لیے اس بات کو پسند کرتا ہے

کہ وہ ایسا منافقانہ رویہ اختیار کریں اور نہ غیر مسلموں سے خواہش کرتا ہے کہ وہ اسلامی شعائر کو اختیار کریں اور مسلمانوں کے مذہبی تہواروں میں شریک ہوں۔

(ج) تیسرا درجہ تہذیبی تشبہ کا ہے، یعنی ایسی وضع قطع اور لباس، جو کسی خاص قوم کی شناخت بن گئی ہو اور اس کا مذہب سے تعلق نہ ہو، کو اختیار کرنا، جیسے ہندوستان میں دھوتی کہ اس کا مذہب سے تعلق نہیں؛ لیکن یہ ہندو بھائیوں کی پہچان سی بن گئی ہے، اگر کسی کو دھوتی میں ملبوس دیکھا جائے تو ذہن اسی طرف جاتا ہے کہ وہ ہندو ہے، ایسی مشابہت اور مماثلت اختیار کرنا مکروہِ تحریمی ہے، علامہ ابن تیمیہؒ نے اس پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔
(دیکھئے: اقتضاء الصراط المستقیم: ۱/۹۴)

لیکن تشبہ کی اس جہت میں تبدیلی آتی رہتی ہے؛ کیوں کہ اگر کوئی وضع ایک عہد میں کسی قوم کی پہچان بن گئی ہو اور بعد کو اس کا استعمال عام ہو جائے اور وہ کسی خاص مذہبی گروہ کی شناخت باقی نہ رہ جائے تو پھر تشبہ کی کیفیت ختم ہو جائے گی اور اس کا استعمال جواز کی حد میں آجائے گا، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے کوٹ، پینٹ کے بارے میں (امداد الفتاوی: ۴/۲۶۸ سوال نمبر ۳۴۵) اور حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے ساری کے متعلق یہی لکھا ہے۔ (کفایت المفتی: ۹/۱۶۱)

(د) جو ملبوسات، وضع قطع اور تقریبات کسی خاص مذہبی گروہ کی پہچان نہیں ہیں، یا انتظام و انصرام سے متعلق امور، جیسے طرزِ تعمیر، دفتری نظم و نسق، تجارتی طور و طریق وغیرہ، ان میں غیر مسلم بھائیوں کے طریقۂ کار سے استفادہ کرنے میں کچھ حرج نہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حساب و کتاب کے نظام میں روم و ایران کے طریقوں سے استفادہ کیا تھا، (الفاروق مکمل: ۲/۱۳۰) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ احزاب میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورہ پر اہل فارس کے طریقہ پر خندق کھودوائی تھی۔ (البدایہ والنہایہ: ۴/۹۵)

یہ اس بات پر دلیل ہے کہ ایسے امور میں غیر مسلم بھائیوں کے تجربات سے فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں۔

تشبہ اور مشابہت سے بچنے کا جو اصولی حکم شریعتِ اسلامی میں دیا گیا ہے، وہ تعصب

اور تنگ نظری پر مبنی نہیں ہے؛ بلکہ اس کا مقصد تہذیبی ہمہ رنگی کو برقرار رکھنا ہے، اسی لیے وہ دوسری قوموں سے بھی اس بات کا مطالبہ نہیں کرتا کہ وہ مسلمانوں کی وضع قطع کو اختیار کریں۔

اصل یہ ہے کہ شناخت کی حفاظت ایک فطری عمل ہے، غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی صورت اور آواز کو ایک دوسرے سے ممتاز رکھا ہے، انسان کے اندر شناخت کی حفاظت کا جذبہ اتنا اتاہ ہے کہ ہر ملک اور ہر قوم اپنی شناخت الگ رکھنا چاہتی ہے، اپنے تمدن کی حفاظت کرتی ہے، اپنے جھنڈے الگ رکھتی ہے، ہر اسکول اپنا مستقل یونیفارم رکھتا ہے، گورنمنٹ کے مختلف محکموں کے الگ الگ یونیفارم ہوتے ہیں؛ اس لئے اپنی شناخت کی حفاظت کوئی مذموم عمل نہیں ہے اور نہ اس میں دوسروں کی مخالفت اور ان کے بارے میں تنگ نظری ہے، اسلام چاہتا ہے کہ مسلمان اپنی پہچان کو باقی رکھیں اور جہاں اسلامی نظام نافذ ہو، وہاں غیر مسلم بھائیوں کو بھی اس بات کی پوری آزادی فراہم کی جائے کہ وہ اپنی مذہبی وتہذیبی شناخت کے ساتھ زندگی گذاریں۔

دوسرے مذاہب کا احترام اور عدم مداخلت

مذہبی تعلقات کی دوسری بنیاد دوسرے مذاہب کا احترام اور ان کے مذہبی امور میں عدمِ مداخلت ہے، قرآنی تعلیمات کا نچوڑ عقیدۂ توحید کی دعوت ہے، اسلام میں توحید سے زیادہ کوئی چیز مطلوب ومحمود نہیں اور شرک سے زیادہ کوئی چیز قابل ترک اور مذموم نہیں؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے حد درجہ مذہبی رواداری کی تعلیم دی ہے، قرآن مجید نے صاف کہا ہے کہ ہر شخص کو عقیدہ کی آزادی حاصل ہے اور کسی مذہب کے قبول کرنے کے لیے جبر وتشدد جائز نہیں:

لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۔ (البقرۃ:۲۵۶)

دین میں کوئی جبر نہیں، ہدایت گمراہی کے مقابلہ میں واضح ہو چکی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا:

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۔ (یونس:۹۹)

کیا آپ لوگوں کو اس بات پر مجبور کردیں گے کہ وہ ایمان لائیں؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ مشہور ہے کہ انہوں نے اپنے وسق نامی غلام سے بار بار خواہش کی کہ وہ اسلام قبول کر لے، آپؓ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر تم اسلام قبول کرلو تو تمہیں مسلمانوں کی امانت کی کوئی ذمہ داری سونپوں گا؛ لیکن وسق اس سے ہمیشہ انکار کرتے رہے، حضرت عمرؓ ہمیشہ اس کے جواب میں فرماتے: "لَا اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ" یہاں تک کہ وفات کے قریب آپؓ نے ان کو آزاد کردیا۔ (کتاب الاموال: ۱/۱۵۴)

مذہب پر عمل کی آزادی

عقیدہ کے علاوہ غیر مسلموں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی بھی مکمل آزادی حاصل ہے، قرآن مجید نے صاف طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے مشرکین مکہ کو کہلایا: "لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ" (الکافرون:۶) "تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین" ایک اور موقع پر ارشاد ہے: "لَنَا اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ" (الشوریٰ:۱۵) "ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رواداری کا حال یہ تھا کہ نجران کے عیسائیوں کا وفد بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوا تو آپؐ نے ان کو ان کے مذہب کے مطابق اور ان کے قبلہ کی طرف رخ کرکے مسجدِ نبویؐ میں نماز ادا کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ (احکام الذمۃ: ۱/۳۱۶) فقہاء نے لکھا ہے کہ:

> اگر کسی مسلمان کی بیوی یہودی یا عیسائی ہو اور اس کے عقیدہ کے مطابق کسی خاص دن روزہ رکھنا واجب ہو تو مسلمان شوہر اسے روزہ رکھنے سے روک نہیں سکتا ہے، گو اس کی وجہ سے وہ جنسی استفادہ کے حق سے محروم ہوتا ہے۔
>
> (احکام اہل الذمۃ: ۱/۳۱۶)
>
> اسی طرح اگر وہ اپنے عقیدہ کے مطابق صلیب پہنے، یا مسلمان شوہر کے گھر میں صلیب رکھے تو اسے یہ حق ہے اور شوہر اس کو روک نہیں سکتا۔
>
> (حوالہ سابق)

یہ بھی ضروری ہے کہ دوسرے مذہبی گروہوں کے مذہبی جذبات کو مجروح نہ کیا جائے اور دوسری قومیں جن دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش کرتی ہوں، ان کو برا بھلا نہ کہا جائے؛ حالانکہ یہ بات ظاہر ہے کہ اسلام خدا کی ذات وصفات میں کسی کی شرکت کو جائز نہیں سمجھتا؛ کیوں کہ یہ سچائی اور واقعہ کے خلاف ہے؛ لیکن پھر بھی مذہبی رواداری کے تحت ان معبودانِ باطل کے بارے میں ناشائستہ باتیں کہنے سے منع کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا تَسُبُّوْا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ . (الانعام:۱۰۸)

وہ اللہ کے سوا جن کی عبادت کرتے ہیں، تم ان کو برا بھلا نہ کہو۔

عبادت گاہوں کا احترام

اسی طرح عبادت گاہوں کے معاملات میں بھی تمام اہل مذاہب کے جذبات کو ملحوظ رکھنے کی ترغیب دی گئی ہے، قرآن مجید نے جہاں عبادت گاہوں کے منہدم کرنے کی مذمت کی ہے، وہاں مسلمانوں کی مسجدوں سے پہلے یہودیوں اور عیسائیوں کے گرجوں کا ذکر فرمایا ہے، (الحج:۴۰) اس سے ظاہر ہے کہ عبادت گاہیں خواہ کسی مذہب کی ہوں، ان کا احترام ملحوظ رکھنا چاہیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نجران سے جو معاہدہ کیا، اس میں یہ صراحت فرمائی کہ ان کی عبادت گاہیں منہدم نہیں کی جائیں گی اور نہ مذہبی امور میں کوئی مداخلت کی جائے گی، (ابوداؤد، حدیث نمبر:۳۰۴۱) عہدِ صدیقی میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ذریعہ حیرہ کا علاقہ فتح ہوا، اہل حیرہ کے لیے انہوں نے جو دستاویز تیار فرمائی، اس میں بھی یہ صراحت موجود ہے کہ ان کے چرچ اور گرجے منہدم نہیں کیے جائیں گے، امام ابو یوسفؒ نے اسے نقل کیا ہے۔ (موسوعۃ الخراج:۱۴۳)

اس سلسلہ میں خلافتِ راشدہ اور بعد کے مسلم عہد میں بہت سی مثالیں موجود ہیں، جن کا ذکر اس وقت درازیٔ تحریر کا باعث ہوگا؛ لیکن اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام عقیدۂ توحید کی حفاظت اور اپنی شناخت کی بقاء کے سلسلہ میں جس قدر حساس ہے، غیر مسلموں کے مذہبی اور سماجی مسائل میں اسی قدر کشادہ قلب، سیر چشم اور رواداربھی ہے، افسوس کہ اس پر غلط فہمیوں کے تہ در تہ دبیز پردے ڈال دیے گئے ہیں۔

جہاد ـــــ حقیقت اور غلط فہمی

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات کے موضوع پر شکوک وشبہات کے کانٹے آج کل جس عنوان سے بوئے جاتے ہیں، وہ ہے جہاد، جہاد کی ایسی تصویر پیش کی جاتی ہے کہ گویا ہر مسلمان تلوار تھامے گھر سے نکلتا ہے اور جس غیر مسلم کو پاتا ہے اسے تہِ تیغ کر دیتا ہے، اسی لیے آج کل دہشت گردی اور جہاد کو ہم معنی الفاظ سمجھ لیا گیا ہے؛ حالاں کہ جہاد ایک قانونی عمل ہے اور دہشت گردی غیر قانونی عمل۔

قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ. (البقرۃ:۱۹۱)

اللہ کے راستہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو، جو تم سے جنگ کر رہے ہیں اور حد سے تجاوز نہ کرو، بیشک اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

اس آیت میں ''حد سے تجاوز کرنے'' کو منع کیا گیا ہے، حد سے تجاوز کرنے کا کیا مطلب ہے؟ اوّل یہ کہ جو لوگ تم سے برسرِ پیکار نہ ہوں، تم بھی ان سے جنگ نہ کرو، دوسرے یہ کہ جب جنگ ہو تو انسانی تقاضوں اور جنگ کے مہذب قوانین کو ملحوظ رکھو، عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور معذوروں، نیز جنگ میں حصہ نہ لینے والوں اور مذہبی پیشواؤں پر ہاتھ نہ اٹھاؤ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاءِ راشدین نے جنگ میں ان لوگوں کو نشانہ بنانے سے منع فرمایا ہے۔ (سنن ابی داود، حدیث نمبر ۲۱۶۴)

ایک اور موقع پر قرآن نے ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے، جن سے جہاد کا حکم ہے، کہا ہے:

اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ. (محمد:۱)

جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستہ سے روکا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ محض کفر کی وجہ سے جہاد کا حکم نہیں دیا گیا؛ بلکہ کفر کے ساتھ ساتھ ان کے ظلم وزیادتی اور جبر واستبداد کے سبب جہاد کا حکم فرمایا گیا، قرآن نے اس

مضمون کو ایک سے زیادہ مواقع پر بہت ہی صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جو غیر مسلم حضرات مسلمانوں سے آمادۂ پیکار نہ ہوں اور صلح جو ہوں، مسلمانوں کو بھی ان کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھانا چاہئے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا ۔ (النساء:۹۰)

اگر وہ تم سے کنارہ کش رہیں، پس تم سے جنگ نہ کریں اور تمہاری طرف صلح کی پیش کش کریں تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ان کے خلاف دست درازی کی کوئی گنجائش نہیں رکھی ہے۔

وَإِن جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (الانفال:۶۱)

اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لئے آمادہ ہو جاؤ۔

ان آیات سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جنگ، جنگجوؤں اور شدت پسندوں سے ہے، نہ کہ صلح جوؤں اور امن پسندوں سے؛ بلکہ اگر کسی غیر مسلم گروہ سے امن کا معاہدہ ہو اور وہ کسی مسلمان گروہ کے در پئے آزار ہوں، تو سیاسی طور پر اور پر امن طریقوں سے تو مسلمانوں کی مدد کی جائے گی اور سیاسی و اخلاقی دباؤ ڈالا جائے گا؛ لیکن ان کے خلاف قتال کرنا اور عہد کو توڑ دینا پھر بھی درست نہیں ہوگا، اس سلسلہ میں قرآن مجید کی یہ صراحت بہت ہی قابل توجہ ہے:

وَإِنِ اسْتَنصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۔ (الانفال:۷۲)

اور اگر وہ (مسلمان) تم سے دین کے معاملہ میں مدد کے طلبگار ہوں تو تم پر ان کی مدد کرنا واجب ہے؛ لیکن ایسی قوم کے خلاف نہیں کہ تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہو اور تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ اسے دیکھ رہے ہیں۔

قرآن مجید کے ان ارشادات کو سامنے رکھ کر یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جہاد کا حکم کن لوگوں سے ہے؟ صرف ان لوگوں سے، جو مسلمانوں سے جنگ کرنے پر تلے ہوئے

ہوں، جن لوگوں سے مسلمانوں کا معاہدۂ امن ہو یا جو لوگ غیر جانبدار ہوں، نہ ان سے جنگ ہو اور نہ ان سے کوئی معاہدہ ہو، ایسے لوگوں سے جہاد کا حکم نہیں دیا گیا اور یہ بات ظاہر ہے کہ یہ بالکل انصاف کے عمومی اُصول اور تقاضے کے مطابق ہے کہ ظالموں کا پنجہ تھاما جائے اور انہیں ظلم سے باز رکھا جائے، جو لوگ مسلمانوں سے جنگ نہ کرتے ہوں اور انہیں مشرکین مکہ کی طرح وطن سے بے وطن ہونے پر مجبور نہ کر رہے ہوں، ان کے ساتھ جنگ کے بجائے حسن سلوک اور صلح وآشتی کا حکم دیا گیا، چنانچہ ارشاد ہے:

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۔ (الممتحنۃ:۸)

جو لوگ تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کرتے ہیں اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکال رہے ہیں، اللہ تعالیٰ تم کو ان کے ساتھ بہتر سلوک کرنے اور انصاف کرنے سے نہیں روکتے، بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں۔

حیات نبوی ﷺ اور جہاد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تصادم کے کل بیاسی (۸۲) واقعات پیش آئے ہیں اور زیادہ تر جنگیں مدینہ کے قریب ہوئیں، جو اس بات کی علامت ہے کہ اس میں مسلمان حملہ آور نہیں تھے، ان بیاسی واقعات میں کل ۱۰۱۸/ افراد دونوں طرف سے کام آئے اور اوسطاً ایک جنگ میں گیارہ جانیں گئیں، یہی وہ تعداد ہے، جس کی وجہ سے اسلام کے بارے میں غلط فہمی پھیلائی جاتی ہے کہ اسے تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہے، جب کہ مہابھارت کی ''مقدس جنگ'' میں لاکھوں افراد خود ہندو مذہبی مآخذ کے مطابق مارے گئے اور عیسائی مذہبی عدالت کے حکم پر ایک کروڑ بیس لاکھ افراد کو سزائے موت دی گئی اور ان میں ایک بہت بڑی تعداد وہ تھی، جن کو زندہ جلا دیا گیا؛ لیکن افسوس کہ مغربی اقوام جن کی پوری تاریخ غارت گری، خوں

آشامی اور استعماریت کی داستانوں سے بھری ہوئی ہے، انہوں نے ''چور مچائے شور'' کے مصداق بڑی ہوشیاری کے ساتھ مسلمانوں کی تاریخ پر لکھ دیا:

''بوئے خوں آتی ہے، اس قوم کے افسانوں سے''

جزیہ کی حقیقت

آج کل وی، ایچ، پی کے لوگ اسلام کو بدنام کرنے کے لیے جزیہ کے مسئلہ کو بھی اٹھا رہے ہیں؛ لیکن یہ کوئی نیا اعتراض نہیں ہے، پہلے بھی مستشرقین کی جانب سے اس قسم کے سوالات اٹھائے جاتے رہے ہیں، اہل علم نے تفصیل سے اس کا جواب دیا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ جزیہ سے مراد وہ خصوصی ٹیکس ہے جو اسلامی حکومت غیر مسلم رعایا سے ان کی جان و مال کی حفاظت کے طور پر وصول کرتی ہے، صورتِ حال یہ ہے کہ مسلمانوں پر زکوٰۃ واجب ہے، جسے حکومت وصول کرتی ہے، اگر غیر مسلموں پر بھی زکوٰۃ واجب قرار دی جاتی تو یہ انہیں ایک اسلامی عمل پر مجبور کرنے کے مترادف اور مذہبی آزادی کے مغائر ہوتا؛ اس لیے ان پر ایک جداگانہ ٹیکس ''جزیہ'' کے نام سے لگایا گیا، جو ان کی جان و مال کی حفاظتی نظام کا معاوضہ ہے، یہ ان کے حالتِ کفر میں ہونے کا تاوان نہیں، اگر ایسا ہوتا تو عورتوں، بچوں، بوڑھوں، بیماروں، معذوروں، بے روزگاروں اور ان سب سے بڑھ کر مذہبی طبقہ یعنی پادری، پنڈت وغیرہ سبھوں پر واجب قرار دیا جاتا؛ لیکن ان حضرات کو جزیہ سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے؛ (دیکھئے: احکام الذمۃ: ۱/۱۴۸، ہدایہ: ۴/۳۱۸، باب الجزیۃ) اس لیے اس کی حیثیت محض ایک ٹیکس کی ہے، نہ کہ تاوان کی۔

پھر اس جزیہ کی مقدار بھی کس قدر معمولی ہے؟ کم آمدنی والوں کے لیے سالانہ بارہ درہم، متوسط آمدنی والوں کے لیے سالانہ ۲۴/ اور زیادہ آمدنی والوں کے لیے ۴۸ درہم۔ (بیہقی ۳۲۹/۹، حدیث نمبر ۱۸۶۸۵ باب الزیادۃ علی الدینار بالصلح) ۱۲/ درہم ۱۳/ تولہ سے کم چاندی ہوتی ہے، موجودہ نرخ کے لحاظ سے ۱۲/ درہم ۲۶۵/ روپے سے کچھ کم و بیش ہے، آپ حضرات خود غور کریں کہ اگر کوئی مملکت کسی شہری کی حفاظت اور سیکورٹی پر سال بھر میں اتنا حقیر معاوضہ وصول کرے تو کیا یہ زیادتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہماری حکومت اتنے

پیسے لے کر باشندگانِ ملک کی حفاظت کا انتظام کردے اور ان کے تحفظ کی ضمانت قبول کرے، تو ہم شکرگزار رہوں گے، یہ اس جزیہ کی حقیقت ہے، جس کو لے کر معاندین نے ایک طوفان کھڑا کیا ہوا ہے اور اس کو اسلام کے خلاف ظلم وزیادتی، تشدد اور ناروا داری کا عنوان دیا گیا ہے۔

پس چہ باید کرد؟

ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان اپنے غیر مسلم بھائیوں کو غیر مسلموں کے بارے میں اسلام کی حقیقی تعلیمات، اس کی سیر چشمی، فراخ قلبی اور رواداری سے آگاہ کریں اور خود اپنے رویہ اور برتاؤ سے ثابت کریں کہ اسلام کوئی شدت پسند اور ناروادار مذہب نہیں ہے؛ بلکہ انسانیت پرور، آدمیت نواز، رحم دل، حد درجہ روادار اور سیر چشم، فراخ قلب مذہب ہے اور اس کی ٹھنڈی چھاؤں نہ صرف مسلمانوں؛ بلکہ پوری انسانیت کے لیے مسکن رحمت ہے۔ اِن الدین عند اللّٰہ الإسلام ، اللّٰھم أرنا الحق حقا و ارزقنا اتباعه ، و أرنا الباطل باطلا و ارزقنا اجتنابه ۔

فاصلے کیوں کر گھٹیں گے؟

حالیہ عالمی واقعات کے پس منظر میں عیسائیوں اور مسلمانوں کو قریب کرنے کی بعض کوششوں کا آغاز ہوا ہے، اور اس سلسلہ میں وزیر اعظم برطانیہ اور بعض دیگر عالمی قائدین کے بیانات آئے ہیں، نیز ڈائیلاگ بھی منعقد ہوئے، خدا کرے کہ یہ کوششیں اخلاص اور مفاہمت کے جذبہ پر مبنی ہوں اور اسلام کے بارے میں جو غلط فہمیاں عالمی سطح پر پھیلائی گئی ہیں، یہ ان کے دور ہونے کا سبب بنیں۔

اسلام مذہب کے معاملہ میں جبر و اکراہ کا قائل نہیں ہے، قرآن مجید نے صاف اعلان کر دیا ہے کہ دین کے معاملہ میں جبر روا نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں اور کتابوں کے ذریعہ ہدایت و گمراہی کو پوری طرح واضح کر دیا ہے: لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی ( ) اگر پیغمبر اسلام ﷺ کا منشا اسلام کو تھوپنا ہوتا تو نہ مدینے میں کوئی یہودی باقی ہوتا، اور نہ فتح مکہ کے بعد مکہ میں کوئی مشرک، اسلام کی آمد سے پہلے یہ مزاج تھا کہ سلطنت کا جو مذہب ہوتا تمام لوگ اسی مذہب کو قبول کرتے اور اس پر عمل کرنے کے پابند ہوتے، اسی لئے روم میں کوئی مشرک اقلیت تھی، نہ ایران میں اہلِ کتاب کا کوئی گروہ تھا، سرزمین عرب میں جب پیغمبر اسلام کے ذریعہ دین ابراہیمی کو تجدید ہوئی تو اتنی شدید مخالفت ہوئی کہ پیغمبر کے سوا کوئی اور شخص اس طوفان کے مقابلہ تھم نہیں سکتا تھا، یہودیوں کی اس وقت اپنی کوئی مملکت نہیں تھی، اسی لئے وہ بکھرے ہوئے تھے، اور نہایت ذلت و نکبت کی زندگی بسر کر رہے تھے، ان میں سے کچھ لوگ وہ تھے جو مدینہ اور اس کے جوار میں آباد ہو گئے تھے، کیوں کہ یہ علاقہ کسی باضابطہ حکومت کی عملداری میں شامل نہیں تھا۔

مذہب کے معاملہ اسلام کی وسیع النظری کی وجہ سے یہ فکر عام ہوئی کہ لوگوں کو کسی

خاص مذہب کے قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے، اسلام نے باضابطہ غیر مسلم اقلیت کے قوانین وضع کیے، ان کے حقوق و واجبات کو قانونی شکل دی، اور ان پر ہونے والی زیادتیوں کے سدِ باب کی تدبیریں کیں، اس سے مختلف مذاہب کے لوگوں کے درمیان بقاء باہم کے اصول پر ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کی راہ ہموار ہوئی، مدینہ تشریف لاتے ہی مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان آپ نے جو عہد نامہ مرتب فرمایا وہ اسی اصول پر مبنی تھا، جس میں بہت صاف طور پر اس بات کا اعلان کیا گیا تھا کہ تمام باشندوں کو اپنے اپنے دین پر قائم رہنے کا حق حاصل ہوگا، اور اگر کوئی بیرونی دشمن حملہ آور ہو تو وہ ایک دوسرے کی طرف سے مدافعت کریں گے، جب تک یہودیوں کی طرف سے بار بار اس عہد کی خلاف ورزی نہ ہوگی اور انہوں نے اہلِ مکہ کی طرف سے مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کی سازش میں شریک نہیں ہوئے، مسلمان اپنے عہد پر قائم رہے۔

اسلام میں اہلِ ذمہ سے متعلق جو قوانین ہیں، وہ سب اسی بقاء باہم کے اصول پر مبنی ہیں، یہ تو نہیں ہو سکتا کہ مسلمان ان افکار و خیالات کو قبول کرلیں جس سے ان کے ایمان و عقیدہ پر حرف آئے، لیکن اسلامی تعلیم یہ ہے کہ ہم غیر مسلموں کو حق و ہدایت کی طرف بلانے کی کوشش کریں، اور اگر وہ اسے قبول نہ کریں تو ان کے عقیدہ و عمل کے معاملہ کو اللہ کے حوالہ کردیں، اور دنیا میں انسانی رشتۂ اخوت کے تحت ان کے ساتھ بہتر سلوک روا رکھیں، مسلمانوں نے اپنی تاریخ میں ہمیشہ اسے برت کر دکھایا ہے، جب یہود پوری دنیا میں ذلیل و رسوا تھے، اور جگہ جگہ سے شہر بدر کیے جا رہے تھے، اس وقت عالم اسلام ہی میں ان کو پناہ ملتی تھی، صلیبی جنگوں میں عیسائی دنیا کی اپنے مسلمان مفتوحین کے ساتھ انسانیت سوز زیادتیوں کے باوجود مسلمانوں نے اپنے مفتوحہ علاقوں میں عیسائی رعایا کے ساتھ ہمیشہ حسنِ سلوک کیا، اور ان کے سلاطین کا سلوک ہندو اور مسلم رعایا کے ساتھ برابری کا رہا، اگر پوری دنیا میں اس حقیقت کو تسلیم کرلیا جائے کہ تمام اہلِ مذاہب کو اپنے اپنے مذہب اور طور و طریقہ پر عمل کرنے کی اجازت ہے اور اپنی تہذیب و ثقافت کو اپنے آپ پر نافذ کرنے کا حق ہے، تو تہذیبی تصادم کی نوبت نہ آئے، اگر مذہب یا تہذیب کے حامل

افراد اپنی چاہت کو دوسروں پر مسلط کرنا چاہیں اور اس بات کے خواہاں ہوں کہ ان کی فکر ہر قوم اور ہر خطہ میں سکہ رائج الوقت بن جائے تو یقیناً اس سے مختلف مذاہب اور تہذیبوں میں تصادم کی صورت پیدا ہوگی، اس وقت صورتحال یہی ہے، الجزائر اور ترکی میں جمہوری طریقہ پر عوام کے منتخب نمائندوں کو اس لئے حق نمائندگی سے محروم کردیا گیا کہ وہ مغربی ثقافت کے مقابلہ اسلامی ثقافت کے علمبردار تھے، اسی اصول پر سوڈان اور یمن کو دہشت گرد قرار دیا جارہا ہے، اور دنیا کے بعض دوسرے علاقوں میں مسلمان اور مسلم مملکت میں ظلم و زیادتی کا ہدف بن رہی ہیں۔

بقاء باہم کے اصول کا تقاضا ہے کہ تمام انسانیت کے خون کو ایک نظر سے دیکھا جائے اور ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی ایک ہی قیمت لگائی جائے، رسول اللہ ﷺ نے غیر مسلم بھائیوں کے بارے میں فرمایا: ان کے خون ہمارے خون کی طرح اور ان کا مال ہمارے مال کی طرح ہے، دمانھم کدمائنا و اموالھم کاموالنا، لیکن آج جو لوگ انسانیت کے علمبردار ہیں، کیا وہ پوری انسانیت کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں؟ کیا امریکیوں اور فلسطینیوں کے خون میں فرق نہیں کیا جاتا؟ کیا مشرقی تیمور کے عیسائیوں اور بوسینیا کے مسلمانوں کے تحفظ میں دہرا رویہ اختیار نہیں کیا جاتا؟ اور کیا افغانستان میں بے قصور لوگوں کے خون سے ہولی نہیں کھیلی گئی؟ اور آگ کا طوفان نہیں بپا کیا گیا؟ کیا آج مغرب میں کالوں کو دوسرے درجہ کا شہری بنا کر نہیں رکھا گیا ہے؟ — یہ کیسی انسانیت ہے جو خون اور خون میں فرق کرتی ہو، یہ کیسی تہذیب ہے جس کے پاس چمڑے کا رنگ انسان کی قیمت مقرر کرنے کا پیمانہ ہے، یہ کیسی جمہوریت ہے جو اسرائیل کو دفاع کے نام پر بے گناہوں کا گھر زمین بوس کرنے کی اجازت دیتا ہے، لیکن مسلمانوں کے لئے ان پر روا رکھے جانے والے مظالم کے مقابلہ آہ کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔

دنیا کی مختلف قوموں میں فاصلے دور کرنے اور ان کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کے لئے دوسری ضروری تدبیر ''کلمۂ سواء'' کی تلاش ہے، ''کلمۂ سوا'' کیا ہے؟ مختلف قوموں کی مشترک تعلیمات اور متفق علیہ نظریات پر ان کو جمع کرنا، مذہب کی بہت سی

باتیں وہ ہیں جو قدرِ مشترک ہیں، کیوں کہ تمام مذاہب کا اصل سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، مختلف قوموں میں اللہ کی طرف سے انبیاء اور رسل آتے رہے ہیں، یہ سلسلۂ سعادت پیغمبر اسلام جناب رسول اللہ ﷺ تک پایۂ تکمیل کو پہونچا، آپ کی تعلیمات من جانب اللہ محفوظ ہیں، کیوں کہ آپ ﷺ کی نبوت قیامت تک کے لئے ہے، آپ سے پہلے جو کتابیں اتریں، ان کتابوں کے حاملین نے ان میں تحریف وتبدیلی پیدا کردی، اور اب وہ بے آمیز طریقہ پر دنیا میں موجود نہیں ہیں، لیکن چوں کہ ان سب کا اصل سرچشمہ ایک ہی ہے، اس لئے بہت سی صداقتیں پہلی کتابوں میں بھی موجود ہیں، اور ان سچائیوں پر تمام ہی مذاہب کے حاملین یقین رکھتے ہیں، خدا کا تصور، اچھے اور برے عمل کا تصور، جزاوسزا کا عقیدہ، انسانیت کے محبت کی تعلیم، انسانی جان و مال اور عزت و آبرو کے احترام کی تلقین، اور اخلاقی بھلائیوں اور برائیوں کا تصور، یہ تمام مذاہب کے درمیان مشترک ہیں، کون مذہب ہے جو ظلم وجور اور ناانصافی کو روا رکھتا ہو، کون سا دین ہے جس نے جھوٹ اور تکبر کو سراہا ہو؟ کون مذہبی پیشوا ہے جس نے قتل وخون، دوسروں کی عزت ریزی اور لوٹ مار سے منع نہ کیا ہو؟ اگر اقوامِ عالم ان مشترک تعلیمات کو لے کر ایک دوسرے سے بغل گیر ہوں، اور اپنی مذہبی تعلیمات کے دائرہ میں رہتے ہوئے انسانی محبت کی وہ تصویر پیش کریں جن کا ان سے مطالبہ کیا گیا ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ کرۂ فساد، کرۂ امن نہ بن جائے، اور محبت کی شبنم نفرت کے آتش فشاں کو سرد نہ کردے!

قرآن مجید نے اسی کلمہ سواء کی طرف انسانیت کو دعوت دی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ (آل عمران:۶۴)

آپ کہہ دیجئے اے اہلِ کتاب! تم ہمارے اور اپنے درمیان مشترک بات کی طرف آجاؤ۔

قرآن مجید نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ اہلِ کتاب میں سے کس طبقہ میں اس دعوت کو قبول کرنے کی نسبتاً زیادہ صلاحیت ہے، اور کس طبقہ میں نہیں؟ چنانچہ

فرمایا گیا:

لتجدن اشد الناس عداوة للذين آمنوا اليهود والذين اشركوا و لتجدن اقربهم مودة للذين آمنوا الذين قالوا انا نصارى، ذلك بانّ منهم قسيسين و رهبانا و انهم لايستكبرون (المائدۃ:۸۲)

آپ اہلِ ایمان کا سب سے زیادہ دشمن یہودیوں اور مشرکین کو پائیں گے، اور محبت میں مسلمانوں سے قریب تر ان لوگوں کو پائیں گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں، یہ اس لئے کہ ان میں علماء اور درویش ہیں، اور وہ تکبر نہیں کرتے۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہے کہ قومی نفسیات کے اعتبار سے بہ مقابلہ یہود و مشرکین کے عیسائیوں کو مسلمانوں سے زیادہ قربت ہے، چنانچہ آج پوری دنیا میں مسلمانوں کے خلاف جو ریشہ دوانیاں ہورہی ہیں، گوان میں عیسائی اقوام آلہ کار بن رہی ہیں، مگر اصل میں اس کے پیچھے یہودی دماغ کار فرما ہے، تاہم اسلام نے کلمۂ سواء کی بنیاد پر جو اتحاد کی دعوت دی ہے، وہ کسی ایک قوم کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ یہ دعوت پوری انسانیت کے لئے ہے، یہود جن کی عداوت کو قرآن نے کھول کھول کر بیان کیا ہے، اس آیت میں ان کو بھی اشتراک کی دعوت دی گئی ہے۔

مذاہب اور قومیں اس طرح ایک دوسرے کے قریب نہیں ہوسکتیں کہ ایک قوم دوسری قوموں کو نگل جائے، اور ایک تہذیب دوسری تہذیب کو اپنا لقمۂ تر بنالینا چاہے، بلکہ فاصلے اس وقت گھٹیں گے، اور اجنبیت کی دیواریں اس وقت چھوٹی ہوں گی جب ہم اسلام کے پیش کئے ہوئے ان دونوں اصولوں کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنائیں، بقاء باہم اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی صلاحیت اور مشترکہ تہذیبی، اخلاقی اور مذہبی قدروں پر قوموں کا باہمی اشتراک وتعاون!

(یکم رفروری ۲۰۰۲ء)

دہشت گردی کا مسئلہ — حقیت پسندانہ تجزیہ

جیسے کسی انسان کے لئے ہوا اور غذا سب سے زیادہ بنیادی ضرورت ہے، اسی طرح انسانی سماج کے لئے سب سے بڑی ضرورت امن وسلامتی ہے، اسی لئے قرآن مجید نے عربوں کو اللہ تعالیٰ کا احسان یاد دلاتے ہوئے خاص طور پر دو باتوں کا ذکر کیا ہے، ایک یہ کہ وہ خدا ہی ہے جس نے اس وادی غیر ذی زرع میں بسنے والوں کو بھی غذا فراہم کی اور ان کے لئے بھوک سے نجات کا سرو سامان پیدا کیا، دوسرے ایک ایسی سرزمین جہاں حکومت نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور لا قانونیت ہی سب سے بڑا قانون تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کی نعمت سے سرفراز فرمایا: اَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوْعٍ وَّآمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ (قریش:۴)

دہشت گردی سماج کے امن وامان اور سلامتی کے لئے سم قاتل ہے۔ جو سماج مامون نہ ہو، جس معاشرہ میں ہر وقت انسان کو اپنی جان ومال کے بارے میں خطرہ لگا رہتا ہو اور جہاں ہر لمحہ انسان اپنی عزت وآبرو کے بارے میں اندیشہ سے دو چار ہو، وہاں علمی ترقی رک جاتی ہے، تہذیب وتمدن انحطاط پذیر ہونے لگتا ہے، اخلاقی پستی پیدا ہونے لگتی ہے اور عدم تحفظ کا احساس ہر شعبۂ زندگی میں ترقی کے لئے رکاوٹ بن جاتا ہے، اس لئے دہشت گردی پر فکر مند ہونا اور اس کی وجہ سے خوف زدہ ہونا ایک فطری بات ہے۔

اسلام ایک ایسا مذہب ہے کہ امن اور سلامتی اس کی خمیر میں داخل ہے۔ اس مذہب کے ماننے والوں کے لئے اس نے دو لفظ استعمال کیا ہے: ''مومن'' اور ''مسلم'' یہ دونوں ہی تعبیر اسلام کی امن پسندی کا مظہر ہے۔ مومن امن سے ماخوذ ہے، یعنی ایسا شخص جو دوسروں کو امن دینے والا ہو اور مسلم ''سلم'' سے ماخوذ ہے، جس کے معنی صلح اور سلامتی کے ہیں، اس طرح مسلم کے معنی ایسے شخص کے ہیں جو صلح جو ہو اور جس سے دوسروں کو

سلامتی حاصل ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے بعض ارشادات سے اس حقیقت کو واضح فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ حقیقی مومن وہ ہے کہ جس سے اس کے پڑوس کے لوگ امن میں رہیں۔ (بخاری:۶)

لیکن سب سے پہلے خود یہ بات سمجھنے کی ہے کہ دہشت گردی ہے کیا؟ دہشت گردی دوسروں پر ظلم وتعدی اور جور وستم کا نام ہے یا ظالم کے پنجہ کو تھامنے کی کوشش بھی دہشت گردی ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی صاحب انصاف اس بات کا قائل نہیں ہوگا کہ ظلم کے خلاف احتجاج بھی دہشت گردی کہلانے کا مستحق ہے۔ دنیا کی مختلف قوموں نے ان ظالم و جابر قوموں کے خلاف احتجاج کیا ہے جنہوں نے ملکوں اور قوموں کو اپنا غلام بنانے کی کوشش کی اور آزادی کی اس لڑائی نے کتنے ہی انسانوں کی جانیں لی اور ان کے لہو سے اپنی پیاس بجھائی، تو کیا ان مجاہدین آزادی کو بھی دہشت گرد کہا جائے گا؟ خود ہمارے ملک ہندوستان میں نوے سال آزادی کی خونچکاں لڑائی لڑی گئی، یہ لڑائیاں اسی لئے ہوئیں کہ ہم انگریزوں کا طوقِ غلامی اپنی گردن سے نکال پھینکنے کے لئے بے چین تھے۔ اگر ہم غلامی کو برداشت کر لیتے، تو یقیناً بہت سے انسانیت سوز واقعات پیش نہیں آئے ہوتے، تو کیا جدو جہد آزادی کو بھی دہشت گردی شمار کیا جائے گا؟

نہیں اور یقیناً نہیں !! تو معلوم ہوا کہ مظلوم کا سر اٹھانا اور ظالم کے خلاف اس کا صف آرا ہونا دہشت گردی نہیں ہے بلکہ دہشت گردی کا مقابلہ ہے۔ دنیا میں کوئی مذہب نہیں جس نے ظالم سے نبرد آزما ہونے کو ظلم اور دہشت کا نام دیا ہو۔ ہندو تاریخ میں کورو اور پانڈو کی جنگ مشہور ہے اور اس موقع سے جناب کرشن جی نے ارجن کو جو اپدیش دیئے، وہ آج بھی گیتا میں محفوظ ہیں۔ اس میں یہ پیغام ہے کہ اپنے جائز حق کے لئے اٹھ کھڑا ہونا اور ناانصافی کے خلاف سینہ سپر ہو جانا دہشت گردی نہیں، بلکہ ایک ''مقدس جہاد'' ہے۔ قرآن مجید نے بھی بڑی لطیف تعبیر میں کہا ہے کہ کسی بُری بات کو کھلے عام کہنا خدا کو پسند نہیں، لیکن جو شخص مظلوم اور ستم رسیدہ ہو، اس کو یقیناً احتجاج کا حق حاصل ہے۔ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (النساء:۱۴۸)

عجیب بات ہے کہ اس وقت دنیا میں جو قومیں جتنی زیادہ دہشت گرد ہیں، وہ اسی قدر دوسروں کے دہشت گرد ہونے کا شور مچاتی ہیں۔ امریکہ، ایران اور سوڈان کو دہشت گرد کہتا ہے، حالاں کہ خود امریکہ نے رضا شاہ پہلوی کے واسطہ سے ایران اور سوڈان کے باغی قبائل کی آڑ میں سوڈان پر کتنے ہی مظالم ڈھائے ہیں اور بین الاقوامی دہشت گردی کا ارتکاب کیا ہے، اسرائیل فلسطین اور شام کو دہشت گرد قرار دیتا ہے، حالانکہ وہ خود پورے فلسطین اور شام کے کچھ حصے پر ناجائز طریقے پر قابض ہے اور کئی بار عربوں کے قتل عام کا مرتکب ہو چکا ہے۔ مغربی قومیں افغانستان اور موجودہ طالبان کو دہشت گرد کہتی ہیں، حالانکہ زیادتی خود ان کی ہے کہ جو حکومت ملک کے تین چوتھائی حصوں سے بھی زیادہ پر قابض ہے وہ اس کو تسلیم نہیں کرتے اور ایسے خود ساختہ حکمرانوں کو تسلیم کرتے ہیں جن کی حکومت کا اندرون ملک کوئی وجود نہیں۔ مصر الاخوان المسلمون اور ترکی وہاں کی اسلام پسند جماعت کو بنیاد پرست اور دہشت گرد قرار دیتے ہیں اور خود جمہوریت کا گلا گھونٹے ہوئے ہیں اور انتخاب کے بجائے اسلحہ کی طاقت کے سہارے تخت حکمرانی پر متمکن ہیں۔

ہمارے ملک کا بھی حال اس سے مختلف نہیں، جن لوگوں نے کھلے عام بابری مسجد کو شہید کیا، مظلوم اور نہتے مسلمانوں پر گولیاں برسائیں اور ممبئی اور سورت میں ظلم و جور کا برہنہ رقص کیا، وہ دہشت گرد نہیں کہلائے اور جن لوگوں نے اس ظلم پر صدائے احتجاج بلند کی اور ردعمل پر مجبور ہوئے ان کو دہشت گرد کہا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ دہشت گردی کے لفظ کے ساتھ ناانصافی ہے اور کوئی بھی معقول اور منصف مزاج آدمی اس کو قبول نہیں کر سکتا۔

اس لئے سب سے پہلے خود دہشت گردی کا مفہوم متعین کرنے کی ضرورت ہے۔ ظالم کو دہشت گرد کہنے سے گریز اور مظلوم کو دہشت پسند کہنا بجائے خود ایک ''اخلاقی دہشت گردی'' اور یقیناً اس سے دہشت گردی میں اضافہ ہی ہوگا اور مشکلات کا حل نہیں نکل سکے گا! تاہم اس بات کی وضاحت مناسب ہوگی کہ اسلام اس شخص کو بھی لاقانونیت اور جائز حدود سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دیتا جس کے ساتھ زیادتی کی گئی ہو، اسی لئے قرآن نے اصول مقرر کر دیا کہ کسی زیادتی کا بدلہ لینا اسی زیادتی کی حد تک روا ہے: جَزَاءُ

سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (الشوریٰ ۴۰) اور آپ ﷺ نے فرمایا: لا ضرر ولا ضرار (موطا امام مالک) یعنی نہ کسی کو ابتداءً نقصان پہنچایا جائے اور نہ جواباً نقصان پہنچانے میں حد سے تجاوز کیا جائے۔

لیکن دہشت گردی کے علاج کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے ان اسباب ومحرکات پر غور کیا جائے اور ان کا سدِ باب کیا جائے جو شریف اور تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی دہشت گرد بناتے ہیں۔ بنیادی طور پر احساس محرومی اور قانونی راستہ سے حقوق کے تحفظ اور ناانصافیوں کے تدارک سے مایوسی اور ناامیدی دہشت گردی کو جنم دیتی ہے، کبھی معاشی محرومی، سرمایہ داری کے خلاف آتش اشتعال کو بھڑکاتی ہے، ہمارے ملک میں نیکسلائیٹ تحریک اسی پس منظر میں اُبھری ہے اور اسی احساس محرومی نے بے روزگار نوجوانوں کی ایک قابلِ لحاظ تعداد کو ان کے گرد اکھٹا کر دیا ہے، کبھی سیاسی محرومی دہشت گردی کا سبب بنتی ہے، کشمیر، پنجاب اور آسام اس کی کھلی مثال ہے، جن کو مسلسل نظر انداز کیا جاتا رہا اور اسی نے ان کو امن کی میز سے جنگ کارزار میں پہنچا دیا ہے، کبھی اس کا سبب قومی ناانصافی اور فرقہ وارانہ زیادتی بھی ہوتا ہے، پھولن دیوی کا کردار اور مایاوتی کی اونچی ذات والوں کے خلاف دشنام طرازی اس کی کھلی ہوئی مثال ہے۔ ان اسباب وعوامل پر توجہ نہ دینا اور ان کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے ردعمل کو دہشت گردی کا نام دے کر بزور قوت ختم کرنے کی کوشش، جڑ کے بجائے ٹہنیوں پر پانی ڈالنے کے مترادف ہے۔

اسلام کا مزاج یہ ہے کہ وہ ہمیشہ مشکلات کی اصل بنیاد کو تلاش کرتا ہے اور اصل مرض کی شناخت کر کے اس کے علاج کی طرف اولین توجہ دیتا ہے۔ عرب جاہلیت سے زیادہ دہشت گردی اور لاقانونیت شاید ہی تاریخ میں کہیں رہی ہو، لیکن اسلام نے نہایت خوبی سے اس کا علاج کیا اور ان ہی لوگوں کو جن کی وحشت ضرب المثل تھی، پوری دنیا میں امن کا پیامبر بنا کر کھڑا کیا۔ اسلام کو یہ کامیابی اسی لئے ملی کہ اس نے ان اسباب وعوامل پر توجہ دی۔ سب سے زیادہ جو چیز انسان کو دہشت گردی پر اُبھارتی ہے وہ معاشی محرومی کا احساس ہے۔ اسلام نے اولاً تو آخرت کا یقین پیدا کیا اور دنیا کی نعمتوں اور لذتوں کو ایک

فانی اور آنی جانی چیز قرار دیا مَا الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (الحدید:۲۰)

جب دلوں میں متاعِ دنیا کی محبت کم ہو جائے اور اس کی بے ثباتی کا یقین بیٹھ جائے تو وہ دنیا کی محرومی کو آخرت کی سرفرازی میں تلاش کرنے لگا اور یہ احساس اس کو اہلِ ثروت کے خلاف بغاوت پر نہیں اکسائے گا، بلکہ وہ اپنے فقر و افلاس میں بھی ایک لذت اور حلاوت محسوس کرے گا، پھر اسلام نے دولت کے ارتکاز کو ناپسند کیا اور اس کی تقسیم اور گردش کے مربوط اور مرتب نظام کو وجود بخشا، میراث کا نظام، زکوٰۃ و صدقات، سود کی حرمت، ذخیرہ اندوزی کی ممانعت وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو ایک جگہ دولت کو مرتکز نہیں ہونے دیتیں، ان کے علاوہ محتاجوں اور ضرورت مندوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی اخلاقی تعلیمات ان کے علاوہ ہیں۔ یہ وہ احکام ہیں جو اہلِ دولت میں انفاق کا جذبہ پیدا کرتے ہیں اور غرباء کو محرومی کے احساس سے محفوظ رکھتے ہیں۔

سیاسی سطح پر کسی طبقہ کو دبا کر رکھنے کی اسلام نے اجازت نہیں دی، اسلام نے ذات اور برادری کی بنیاد پر عہدے اور ذمہ داریوں کی تقسیم نہیں کی، بلکہ صلاحیت اور اہلیت کو اس کے لئے معیار بنایا، انصاف اور حفاظت و سلامتی کے باب میں اسلام نے مسلم اور غیر مسلم کا بھی کوئی فرق نہیں کیا۔ آپ ﷺ نے غیر مسلموں کے بارے میں فرمایا کہ ان کے مال بھی ہمارے مال کی طرح اور کے خون بھی ہمارے خون ہی کی طرح ہیں: دمائهم کدمائنا واموالهم کاموالنا، قرآن مجید نے عدل و انصاف پر زور دیتے ہوئے کہا کہ کسی طبقے کی برائی تم کو ناانصافی کے راستے پر نہ لے جائے اور تم ان کے ساتھ بھی انصاف کا حق ادا کرو: وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا (المائدۃ:۸) مذہبی معاملات میں بھی ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا حکم دیا گیا: لَنَآ اَعْمَالُنَا وَ لَکُمْ اَعْمَالُکُمْ (القصص:۵۵) اسلام نے اس بات کی بھی اجازت نہیں دی کہ ایک شخص کے جرم کا بدلہ دوسرے سے لیا جائے اور کچھ مجرموں کی وجہ سے بے قصور لوگوں کو نشانۂ انتقام بنایا جائے، لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی، (فاطر:۱۸) اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ احتجاج کا قانونی راستہ ہمیشہ کھلا رکھا جائے، اگر احتجاج مبنی بر حقیقت ہے تو اسے قبول کیا جائے اور اگر خلاف

واقعہ ہے تو ان کو مطمئن کیا جائے، ملک کے ایک عام شہری کو بھی بڑے سے بڑے حکمراں کو روکنے اور ٹوکنے کا حق حاصل ہے، اس کا نام قرآن کی زبان میں ''نہی عن المنکر'' اور ''شہادتِ حق'' ہے۔ اگر کچھ لوگ غیر سنجیدہ طریقہ اختیار کریں تو ان کا بھی بہتر طریقہ پر جواب دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: برائی کو نرمی کے ساتھ دور کرو: اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ (مومنون:۹۶) گویا اسلام جوابی دہشت گردی کو بھی پسند نہیں کرتا۔

اسلام سراپا رحمت اور امن و آشتی ہے، وہ عدل و انصاف کا نقیب ہے، رحم اور عفو درگذر سے زیادہ کوئی چیز اس کی بارگاہ میں مقبول نہیں، ظلم و جور اور ناانصافی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں جو اسے ناپسند ہو، اس نے خدا کو جس نام سے بار بار یاد کیا وہ ''رحمن و رحیم'' ہے اور اس نے اپنے پیغمبر کو جس لقب سے ملقب کیا ہے، وہ ''رحمة للعالمین'' ہے، اس کا مرکز ایسا حرم مامون ہے کہ وہاں پرندوں پر بھی کنکری نہیں ماری جاتی اور خودرو پودے بھی اکھاڑنے سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ ایک ایسے مذہب کی طرف دہشت گردی کی نسبت کرنا دن کو رات کہنے کے سوا اور کیا ہے؟ درحقیقت یہ ایسا نعرہ جس میں بہت سی قوموں نے آج اپنی دہشت گردی کو چھپایا ہے۔ دہشت گردی مظلوموں کی آہ و فغاں، صدائے احتجاج اور ظلم سے پنجہ آزمائی کا نام نہیں، بلکہ دہشت گردی خود ظلم و تعدی کا نام ہے، مگر افسوس کہ

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

(۱۷/نومبر ۲۰۰۰ء)

مسلم پرسنل لا: ایک غلط فہمی کا ازالہ

آج کی ترقیات اور انکشافات نے زندگی کی قدریں یکسر تبدیل کر دی ہیں، جو کل رینگتا تھا، وہ آج برق رفتار سواریوں کو وجود میں لا چکا ہے اور ہوا کے دوش پر اڑ رہا ہے، کل تک دریا کی معمولی موجیں جس کے لئے ایک ناقابل تسخیر مصیبت تھی، آج وہ سمندر کا جگر چیر کر لعل و جواہر کی دنیا سمیٹ رہا ہے، کل کا لکڑیاں جلانے اور چراغ میں تیل ڈالنے والا آج برقی، آلات و وسائل کی مدد سے پوری دنیا کو اپنی مضبوط گرفت میں لے چکا ہے، کل تک جو اپنی نحیف آواز میل دو میل کے فاصلے پر پہنچانا بھی ممکن تصور نہ کرتا تھا، آج کی حیرت انگیز ایجادات نے ان کی آواز کو آفاقی بنا دیا ہے اور اس کی آواز بیک وقت ایک دو شہر نہیں پوری کائنات میں پھیل سکتی ہے...... پھر آخر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ اس دور کا قانون آج کی اس ترقی یافتہ دنیا کا ساتھ دے سکے اور ان کے لئے مشعلِ راہ بن سکے!

اس دلیل کو ہمارے مغرب زدہ اور علوم اسلامی سے ناآشنا حضرات نے ایسی تسلیم شدہ حقیقت تصور کر لیا ہے کہ گویا اس میں شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں ہو، حالاں کہ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ جو چیز بدلتی رہی ہے اور بدل رہی ہے، وہ کیا ہے؟ کیا انسان کی فطرت بدل گئی ہے؟ اس کے طبعی تقاضے تبدیل ہو گئے ہیں؟ یا محض وسائل اور اسباب میں تغیر رونما ہوا ہے؟ ذرائع زندگی میں فراوانی آئی ہے؟

اس نکتہ پر جب کوئی شخص غور کرے گا تو اس حقیقت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہے گا کہ ازل سے آج تک دنیا میں جو انقلابات رونما ہوتے رہے ہیں اور جو تبدیلیاں پیدا ہوتی رہی ہیں، ان کا تعلق اسباب و وسائل کی دنیا سے ہے، انسان کی فطرت اور اس کی

طبعی افتاد آج سے دس بیس ہزار سال پہلے جو تھی، وہی اب بھی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

ایک بچہ اپنے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہی اپنے دل میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کی خواہش پاتا ہے، مگر وہ اپنے دست و پا کو اس سے بے بس پا کر روتا ہے، اشارہ کرتا ہے اور اپنے بڑوں کی گود کے سہارے ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا ہے، پھر جب اس کے پاؤں میں اتنی قوت پیدا ہوتی ہے کہ وہ خود سے جنبش کرے اور کسی قدر چل سکے تو وہ گھٹنوں کے سہارے کیڑوں کی طرح زمین پر رینگنا شروع کر دیتا ہے، وہ ذرا بڑھتا ہے تو ہلکے ہلکے قدموں کے ساتھ چلنے کی کوشش کرتا، جوان ہوتا ہے، عمر پختہ ہوتی ہے، جسم میں توانائی آتی ہے تو وہی دوڑنے لگتا ہے، چھلانگ لگاتا ہے، کودتا ہے اور پھر جلد سے جلد پہنچنے کی کوشش میں بسوں اور ٹرینوں، جہازوں اور راکٹوں کی طرف مدد کا ہاتھ پھیلاتا ہے۔ یہ بتدریج پیدا ہونے والی تبدیلیاں اگر غور کیا جائے تو محض وسائل میں رونما ہوتی رہی ہیں، اسباب سفر تبدیل ہوتے رہے ہیں، لیکن اس کے پس پردہ کارفرما انسانی فطرت، یعنی ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کی خواہش، ہر جگہ یکساں طور پر باقی ہے اور اس میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا ہے۔

میں نے یہ محض ایک مثال دی ہے، ورنہ آپ جس چیز کے بارے میں بھی چاہیں، اس انداز میں تجزیہ کر لیجئے، آپ محسوس کریں گے کہ تغیر پذیر محض اسباب ہیں، انسان کی فطرت اپنی جگہ قائم ہے، وہ جس طرح کل کبھی رنج وغم اور کبھی مسرت وشادمانی محسوس کرتا تھا آج بھی کرتا ہے، پہلے آہ وواہ سے اس کا اظہار کرتا تھا اب بھی کرتا ہے، کل جس طرح اس کے دل میں اپنے دشمنوں کے خلاف انتقام کا شعلہ سلگتا تھا آج بھی سلگتا ہے اور جس طرح کل اس کا سینہ مال و دولت اور حرص و ہوس کی آماجگاہ تھا آج بھی اقتصادی ترقی کا بھوت اس کے ہوش وحواس پر سوار ہے، آج بھی اس کا نفس اس کو اخلاقی تقاضوں کے بالائے طاق رکھ دینے کی تلقین کرتا رہتا ہے، جس طرح ماضی کا نقشہ ہمارے سامنے ہے، جس طرح کل جاگیرداری اور زمینداری کی تمنا اس کو بے چین کئے رہتی تھی آج بھی اس کے دل میں حکومت اور اقتدار کی آرزوئیں چٹکیاں لیتی رہتی ہیں،...... پھر ہم دیکھتے ہیں کہ بڑی حد تک وہ فکری بنیادیں بھی آج تک قائم ہیں جو پہلے تھیں، جس طرح پہلے ''سچائی'' کو

''اچھائی'' اور ''جھوٹ'' کو ایک ''پاپ'' تصور کیا جاتا تھا آج کی ترقی یافتہ دنیا میں بھی جھوٹ کو کوئی ''کارِ خیر'' تصور نہیں کیا جاتا، جس طرح کل ''ایفاءِ عہد'' محبوب تھا آج بھی ''عہد شکنی'' معیوب ہے اور جس طرح کل ''ایمانداری'' اور ''انصاف پروری'' محمود تھی آج بھی ''خیانت'' اور ''ظلم وجور'' مذموم ہے۔

معلوم ہوا کہ عہد حاضر کی دلفریب ترقیاں اور تبدیلیاں چاہے وہ کتنی ہی حیرت انگیز اور تعجب خیز ہوں اور کتنی ہی نئی اور انوکھی ہوں، بہر حال انہوں نے اسباب ووسائل میں کسی قدر اضافہ کر دیا ہے اور انسان کے لئے زندگی میں راحت کے کچھ سامان فراہم کر دیئے ہیں، مگر وہ چیز جسے ''انسان'' کہتے ہیں اور جسے ''انسانی فطرت'' کہا جا سکتا ہے، وہ ایک ایسی غیر تغیر پذیر حقیقت ہے جسے زمانہ کی کہنگی اور وقت کا تیز رو سفر کچھ بھی متاثر نہیں کر سکتا۔

اس مرحلے پر آ کر ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ اسلام اور اس کے قانونی نظام کا اصل موضوع اسباب ووسائل نہیں ہیں، بلکہ اس کا موضوع انسان، اس کی فطرت اور اس کے فطری تقاضوں کی مناسب حدود میں تکمیل ہے، پس جس طرح انسان ایک غیر متبدل حقیقت ہے، اسی طرح ظاہر ہے اس سے تعلق رکھنے والا قانون بھی ابدی اور دائمی ہوگا۔

لیکن اس کے باوجود بلاشبہ ان نو دریافت وسائل زندگی، بدلتے ہوئے عرف اور زندگی کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی ڈھانچہ میں غیر معمولی تبدیلی ضرور چاہے گی کہ قانون میں اس کی کچھ رعایت کی جائے اور ان نئے تقاضوں اور وسائل سے اسلامی قوانین کو ہم آہنگ کیا جائے اور جزوی اور فروعی حدود میں اسلام ان تقاضوں کو قبول کرے۔ اس سلسلہ میں ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ اسلام نے بعض قانونی اور فکری امتیاز اور بنیادی اصول کو جوں کا توں باقی رکھتے ہوئے ایک مخصوص حد میں ضروری تغیر وتبدل اور واقعی تقاضوں کی تکمیل کے لئے ایسی لچک باقی رکھی ہے جو اس کو فرسودگی سے بچائے رکھے! چنانچہ مشہور فقیہ اور مزاج شریعت کے رمز شناس حافظ ابن القیم (۱۲۹۱۔۱۳۰) اپنی گراں قدر کتاب ''اعلام الموقعین'' میں اس موضوع پر ایک مستقل باب قائم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

عرف وعادت، حالات ومقاصد اور زمان ومکان کے تغیر کی بنا پر

مسائل میں اختلاف اور تغیر و تبدل کا بیان، یہ بڑی مفید اور اہم بحث ہے، جس سے ناواقفیت کی بنا پر شریعت میں بڑی غلطیاں واقع ہوئی ہیں، جس نے دشواری، تنگی اور استطاعت سے ماورا تکلیف پیدا کردی ہے، جب کہ یہ بات معلوم ہے کہ شریعت جو مصالح کی غیر معمولی رعایت کرتی ہے، ان ناقابلِ برداشت کلفتوں کو گوارا نہیں کرتی، اس لئے کہ شریعت کی اَساس سراپا رحمت اور سراپا مصلحت ہے، لہٰذا جب کوئی حکم عدل کے دائرہ سے نکل کر ظلم و زیادتی، رحمت کی حدوں سے گذر کر زحمت، مصلحت کی جگہ خرابی اور کارآمد ہونے کے بجائے بیکار قرار پائے تو وہ شرعی حکم نہیں ہوگا۔ (اعلام الموقعین: ج ۲)

جس قانون میں ایک ایسا تغیر پذیر اور لچکدار پہلو موجود ہو، اور وہ ہر دور کے سیاسی، اخلاقی حالات، جدید انکشافات و تغیر اور رسوم و عادات کے تحت مناسب تبدیلی کو گوارا کر لیا کرتا ہو اور جس کی اسی وسعت نے اس کو چودہ سو سال تک مسلسل زندہ اور پائندہ رکھا ہو اور تمام انفرادی اور اجتماعی، سیاسی اور اقتصادی مسائل اس کی روشنی میں حل کئے جاتے رہے ہوں، اس کو جامد اور کسی زمانے کے لئے ناکارہ کہنا سوائے عناد کے اور کیا ہے؟ اس قسم کی باتیں عموماً ہمارے مسلمان قانون داں ہی ''ارشاد'' فرماتے رہتے ہیں، حالاں کہ بعض غیر مسلم ہندو اور مستشرقین ماہرین قانون نے عموماً اسلامی فقہ کی تعریف کی ہے اور اس کی افادیت کا اعتراف کیا ہے، چند سال قبل دہلی میں منعقد ہونے والے ایک سمینار میں سابق جج سپریم کورٹ مسٹر وی، آر کرشنا آئر نے کہا کہ: ''یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ہندوستانی سول کوڈ میں اسلامی قانون کی کوئی جگہ نہیں ہے، بلکہ مستقبل میں اسلامی اصول قانون، ہندوستانی سول کوڈ کا ایک بڑا عنصر بن کر رہے گا۔'' اسی سپریم کورٹ کے دوسرے جج نے اپنی تقریر میں کہا کہ ''ہندوستان کے نظام قانون میں اسلام کی دین کسی سے کم نہیں ہے اور مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ہندوستان کے قوانین میں اصولی حیثیت سے اسلامی قانون کے نفاذ کی کوشش کریں۔'' (صدق جدید: ۱۳ر فروری ۱۹۸۱ء)

(۱۳ر اکتوبر ۲۰۰۰ء)

یونیفارم سول کوڈ ـــــ حقیقت پسندانہ جائزہ!

یونیفارم سول کوڈ، تین انگریزی الفاظ کا مجموعہ ہے، یونیفارم کے معنیٰ یکساں، کے ہیں اور سول کوڈ، شہری قانون کو کہتے ہیں، اس طرح ''یونیفارم سول کوڈ'' ایسے شہری حقوق کا نام ہوگا جس میں نسل ونسب، علاقائی عرف وعادت، مذہب واعتقاد، مخصوص سماجی کلچر اور زبان وادب کے اختلاف کے باوجود سبھوں کے لئے یکساں قوانین بنائے جائیں۔

''سِول کوڈ'' کا ایک حصہ ایسا ہے جس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے، ان اُمور میں آزادی سے پہلے بھی یکساں قوانین تھے۔ اب بھی ہیں، اور ان کو ہندوستان کے مخصوص ڈھانچے کے اعتبار سے ایسا ہی ہونا چاہئے۔ اس کا دوسرا حصہ وہ ہے جس کا تعلق ''مذہبی قوانین'' سے ہے، مثلاً نکاح وطلاق، وراثت، وصیت، ہبہ وغیرہ، ہندوستان کی تاریخ میں مسلم عہدِ حکومت سے پہلے بھی، مسلم عہدِ حکومت میں بھی اور دیش دشمن انگریزوں کے زمانہ میں بھی اس حصہ' قانون میں ہر مذہب کے ماننے والے آزاد رہے ہیں اور اس کو ایک ''حق'' کی حیثیت سے ہندوستانی قانون میں بنیادی حقوق کی فہرست میں جگہ دی گئی ہے۔

بدقسمتی سے آزادی کے بعد ہندوستان میں ''یونیفارم سِول کوڈ'' کا ایسا خاکہ پیش کیا جانے لگا جس کی روشنی میں ''پرسنل لا'' بھی اس میں داخل ہو جاتا ہے اور اس طرح ''مسلم پرسنل لا'' پر خطِ نسخ پھیر کر مذہبی امور میں بھی'' یکساں قانون'' بنانے کے لئے زمین ہموار کی جانے لگی، یونیفارم سول کوڈ کی سب سے بڑی مصلحت یہ بتائی جاتی ہے کہ اس کے ذریعہ ''قومی یکجہتی'' اور ''فرقہ وارانہ ہم آہنگی'' پیدا ہوگی، مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان خلیج کم ہو سکے گی، اور ''فرقہ وارانہ کشیدگی'' دور ہوگی۔

حکومت کی یہ فکر لائق صد آفریں ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا'' واقعی'''' یونیفارم

سول کوڈ'' سے یہ مقصد حاصل ہو سکے گا، اور کیا آج جو فرقہ وارانہ تناؤ پایا جاتا ہے اور جمشید پور و مرادآباد اور سورت و بمبئی کے خونچکاں واقعات سامنے آتے ہیں، وہ '' اسی مذہبی امتیاز'' اور تشخص کا نتیجہ ہیں؟

تجربات اور ہمارے ملک کے حالات شاہد ہیں کہ ایسا نہیں ہے، جہاں بھی فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہوتی ہے اور فسادات ہوتے ہیں وہاں ہندو، مسلمان سے یا مسلمان، ہندو سے یہ نہیں پوچھتا کہ ذرا آپ اپنے قوانین بیان فرما دیجئے، اگر میرے مذہب کے مطابق ہو تو بخش دوں گا، ورنہ ابھی سرتن سے جدا کیئے دیتا ہوں، وہاں تو صرف مذہب کا نام پیش نظر ہوتا ہے۔ ایک مسلمان، ہندو تہذیب سے کتنا بھی قریب کیوں نہ ہو، اگر وہ غریب '' مسلمان'' کہلاتا ہے تو گردن زدنی ہے بلکہ ہندوستان کا تجربہ بتاتا ہے کہ یہاں ''مسلم پرسنل لا'' سے ہٹ کر ہونے والے نکاح، اکثر فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لئے مضر ثابت ہوتے ہیں اور جب بھی کوئی '' بین مذہبی'' نکاح ہوتا ہے تو پورا علاقہ ایک طرح کے تناؤ کا شکار رہتا ہے۔

اگر قوانین کی یکسانیت اس ہم آہنگی کے لئے کافی ہوتی تو بنگال میں بنگالی، غیر بنگالی اور آسام میں آسامی، غیر آسامی کا مسئلہ پیدا نہ ہوتا، ہندوستان کی مختلف ریاستوں کی باہمی کشاکش دیکھئے، پاکستان کے مختلف صوبوں کا آپسی تناؤ ملاحظہ کیجئے۔ آخر یہاں کے ہندو اور وہاں کے مسلمان '' قوانین کی یکسانیت'' کے باوجود باہم کیوں دست و گریباں ہیں؟

دوسرے اگر '' قومی یک جہتی'' کے نام پر آج مسلم پرسنل لا کو منسوخ کر دیا جائے تو یہ سلسلہ یہیں رُک نہ سکے گا، اس کے لئے یہ بات زیادہ ضروری ہوگی کہ عبادت گاہوں کا امتیاز بھی ختم ہو جائے، تیوہار اور مخصوص مذہبی دِنوں کی تفریق بھی مٹا دی جائے۔ حرام و حلال اور کھانے پینے میں بھی نظریاتی یکسانیت پیدا کی جائے، اگر '' قومی یک جہتی'' کی قربان گاہ پر اس طرح مذہبی اقدار کو بھینٹ چڑھایا جاتا رہے اور اگر یہی حکومت کا منشا ہے تو صرف ''مسلم پرسنل لا'' کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ کہنا چاہئے کہ اس کام کے لئے ہندوستان سے مذہب کی یکسر بیخ و بن اکھاڑ دی جائے گی ــــ اور یہ شاید ممکن نہیں، کیوں کہ مذہب

ہندوستان کے خمیر میں داخل ہے، جسے ختم کرنے کی کوشش ناکام ہی رہے گی۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ کم از کم اس کے ذریعہ تہذیب میں یکسانیت اور وحدت تو پیدا ہوسکے گی۔مگر یہ بجائے خود ایک بچکانہ بات ہے۔اولاً تو اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ہم تو سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کا اصل حسن تہذیب کی اسی رنگارنگی میں مضمر ہے اور ماضی بعید سے ہندوستان کا یہی امتیاز رہا ہے کہ'' گلہائے رنگارنگ سے ہے زینتِ چمن'' ——— اور اسے مٹایا بھی کہاں جاسکتا ہے؟ آپ قانون ایک کردیں گے لیکن کیا سب کو اپنی زبان بدلنے پر مجبور کردیں گے؟ پھر کوئی سرد علاقہ کا رہنے والا ہے، کوئی گرم علاقہ کا، فطری طور پر وہاں کی بود و باش، لباس و پوشاک ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہوں گے، کیا ان میں بھی اتحاد پیدا کیا جائے گا؟ ایک شخص جو پہاڑی اور ریگستانی علاقوں میں رہتا ہے، دوسرا شخص جو زرخیز اور آبیار سرزمین میں زندگی بسر کرتا ہے، تیسرا شخص جو جنگلوں کے اطراف وجوانب کا رہن سہن رکھتا ہو، کیا ان سب کی تہذیب میں کچھ فرق نہ ہوگا؟ اور پھر کیا ان کے مخصوص حالات کی وجہ سے جو تہذیبی اور تمدنی تشخص ہوگا، آپ اسے مٹادیں گے؟ اور مٹانے پر قادر بھی ہوں گے؟

آپ قانون میں لاکھ یکسانیت پیدا کریں، ایک راجستھانی اور ایک لکھنوی، ایک آسامی اور ایک کشمیری، ایک بنگالی اور ایک حیدرآبادی کی تہذیب میں جو فرق ہے، وہ بہر حال باقی رہے گا، ان کی زبانیں جداگانہ ہوں گی، ان کے لب ولہجہ میں اختلاف ہوگا، ان کے مزاج اور عادتوں میں فرق ہوگا، ان کے انداز واطوار الگ ہوں گے، تہذیب اور سماج کی ان ساری'' دوئیوں'' کے باوجود آخر قانون ہی میں'' اکائی'' پیدا کرنے کی کیا ضرورت لاحق ہوگئی ہے؟

بعض حضرات اس تہذیب فروشی کو رواداری کا تقاضا سمجھتے ہیں، مگر نہ اس کا نام رواداری ہے اور نہ اسلام ایسی'' رواداری'' کا قائل ہے، وہ چاہتا ہے کہ جہاں رہے، اپنا تشخص برقرار رکھے، قانون اور عقیدہ تو بہت اہم چیز ہے، وہ تو وضع قطع اور لباس و پوشاک میں بھی بہت حساس واقع ہوا ہے، ایامِ جاہلیت میں عرب صرف عمامہ استعمال کرتے تھے

یا صرف ٹوپی، رسول اللہ ﷺ نے ان کے طرزِ عمل اور مشابہت سے بچنے کا حکم دیا کہ عمامہ اور ٹوپی دونوں کا استعمال کیا جائے، پھر بعد کو جب پورا جزیرۃ العرب مسلمان ہوگیا تو آپ نے صرف ''ٹوپی'' اور صرف ''عمامہ'' کے استعمال کی بھی اجازت دے دی ___ یہاں تک کہ اسلام تو ''عملِ خیر'' کی انجام دہی میں بھی اپنے آپ کو ممتاز رکھنا چاہتا ہے، یوم عاشورہ (۱۰؍محرم) کو یہود بھی روزہ رکھتے تھے، آپ نے مسلمانوں کو بھی اس کا حکم دیا، لیکن ان کی مشابہت سے بچنے کے لئے ایک اور روزہ کا اضافہ کرکے ''دو روزہ'' رکھنے کی تلقین کی گئی جو مذہب اپنے تشخص اور امتیازات کے معاملہ میں اتنا حساس، وہ اس رواداری کو کیسے قبول کر سکتا ہے؟ ہاں! اسلام بے شک مذہبی رواداری کا قائل ہے مگر ''رواداری'' وہ شئی ہے ہی نہیں، جس کے لئے آج اس کا نام استعمال کیا جاتا ہے، ''مذہبی رواداری'' کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ اپنے عقیدہ، مذہب، تہذیب اور معاشرت پر پوری استقامت اور جماؤ کے ساتھ دوسروں کے ''مذہبی اقدار'' کا بھی احترام کیا جائے، ان کی عبادت گاہوں اور مذہبی طور طریقوں کے ساتھ تمسخر نہ کیا جائے اور ان کے جذبات کو ٹھیس پہونچانے والی دِل آزار باتیں نہ کہی جائیں اور اس حیثیت سے واقعہ ہے کہ اسلام کی رواداری کی کوئی نظیر پیش نہیں کی جاسکتی، وہ اپنی مملکت کی اقلیت کو اس سے زیادہ ''مذہبی آزادی'' دیتا ہے جو آج کی سیکولر حکومتوں میں حاصل ہے۔ وہ ان کو عبادتوں کی، اپنے مذہب کی تبلیغ واشاعت کی، جائز حدود میں اسلام پر فکری اور عقلی تنقید کی اور اپنے عائلی قوانین پر عمل کرنے کی مکمل آزادی دیتا ہے، لیکن تہذیب فروشی کا قائل نہیں ہے اور اس معاملہ میں وہ مسلمانوں کے علاوہ دوسری قوموں کے ساتھ بھی یہی رویہ رکھتا ہے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں غیر مسلم ایرانیوں کو بھی ''عربی اسلامی لباس'' اختیار کرنے سے منع کیا تھا۔

(۶؍اکتوبر ۲۰۰۰ء)

عورت اور اسلام

آج ۸؍ مارچ ہے۔ آج کے دن کو ''عالمی یوم حقوق نسواں'' کی حیثیت سے منایا جاتا ہے۔تو آیئے! ہم آج کے دن کی مناسبت سے جاننے کی کوشش کریں کہ اسلام نے عورتوں کو کیا حقوق عطا کئے ہیں اور ان کے بارے میں اسلامی تعلیمات کیا ہیں؟

رسول اللہ ﷺ کی ذات یوں تو سوکھی ہوئی خزاں رسیدہ انسانیت کے تمام طبقوں پر ابر بہار بن کر برسی ،لیکن خاص طور پر دو طبقہ اس وقت سب سے زیادہ مظلوم، ستم رسیدہ اور قابلِ رحم تھے اور نہ صرف عرب بلکہ ایشیاء، یورپ اور افریقہ کے تمام علاقوں میں ان کی حالت نہایت قابلِ رحم تھی ،روم اور ایران کے لوگ اس زمانے میں تہذیب وتمدن، علم و ہنر اور شائستگی میں ممتاز سمجھے جاتے تھے ،مگر وہاں بھی ان کی حالت بہتر نہ تھی ۔ یہ دو طبقے تھے غلاموں کے اور خواتین کے ،اس لئے فطری بات ہے کہ اسلام نے سب سے زیادہ انہیں دونوں طبقوں کی دستگیری اور غم گساری کی ،ان کو اونچا اٹھایا اور سماج میں عزت واحترام کا مقام دیا۔ یہ اسلامی تعلیمات ہی کا اثر تھا کہ غلامی کا جو رواج ہزاروں سال سے چلا آرہا تھا، چند سو سالوں میں اس کا نام ونشان تک باقی نہ رہا اور اسلام ہی کے اثر سے یورپ اور دنیا کے مختلف علاقوں میں عورتوں پر ظلم کے خلاف تحریکیں اٹھیں اور اس کو ایک اہم سماجی مسئلہ کی حیثیت حاصل ہوئی۔

اسلام سے پہلے عورت کو جائداد کی حیثیت دی جاتی تھی ۔قرآن مجید نے یہ تصور دیا کہ عورت مرد ہی کی طرح انسانیت کا مستقل حصہ ہیں (الحجرات: ۱۳، نساء: ۱۲۴) چوں کہ تورات میں یہ بات کہی گئی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے جنت سے نکلنے کے باعث حضرت حوا ہی تھیں ،اس لئے یہودی اور عیسائی مذہب میں عورت کو گناہ کا دروازہ تصور کیا جاتا تھا۔

قرآن مجید نے اس لغزش میں حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا دونوں کو ذمہ دار قرار دیا، بلکہ حضرت آدم علیہ السلام کو زیادہ ذمہ دار قرار دیا، اور فرمایا آدم نے (بھول کر) اپنے رب کے حکم کے خلاف کیا اور وہ پھسل گئے۔ وَعَصٰى آدَمُ رَبَّهُ فَغَوٰى (طٰہٰ:۱۲۱) یہ فکر وعقیدہ کے اعتبار سے بہت بڑا انقلاب تھا، جس کے ذریعہ ہزار ہا ہزار سال سے جاری غلط فہمی کو دور کیا گیا، اسلام سے پہلے عام طور پر عورتوں کو جائیداد کے مالک بننے اور اس میں کسی قسم کا تصرف کرنے وغیرہ کا حق نہیں تھا۔ اسلام نے عورتوں کو جائیداد میں مالک بننے اور اپنی مرضی سے اس میں عمل کرنے کا پورا اختیار دیا۔ (نساء:۴، ۱۹)

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے عورتوں کو جتنے حقوق دیئے ہیں اور ان کی لطافت و نزاکت کی جتنی رعایت کی ہے، اس سے زیادہ بہتر طور پر کوئی اور مذہبی یا انسانی قانون عورتوں کی مشکلات کو حل نہیں کرتا۔ عورتیں عام طور پر تین مرحلوں سے گزرتی ہیں، بیٹی، بیوی اور ماں بعض دفعہ ناخوشوار حالات میں ایسی صورت بھی پیش آجاتی ہے کہ ایک عورت بیوہ یا مطلقہ ہو جاتی ہے۔ اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ اسلام نے ان مختلف مرحلوں میں عورتوں کو کیا حقوق دیئے ہیں اور ان کے مسائل کس طرح حل کئے ہیں؟

بیٹی: رسول اللہ ﷺ نے بیٹی کی پرورش پر پورا اجر وثواب بتایا ہے۔ فرمایا کہ جس کو دو یا ایک لڑکی ہو اور وہ ان کی اس طرح پرورش کرے کہ تعلیم دے، بہتر طور پر تربیت کرے، تو جنت میں اس کو میرا ساتھ اسی طرح حاصل ہوگا، جیسے یہ دونوں (شہادت اور بیچ کی) انگلیاں (ترمذی ۲/۱۳، باب البر والصلۃ) اس طرح کی خوش خبری آپ ﷺ نے لڑکوں کی پرورش پر بھی نہیں دی ہے۔ لوگ لڑکیوں کی پیدائش پر افسردہ اور غمگین ہو جایا کرتے تھے اور بدقسمتی سے بے دینی اور جہالت کی وجہ سے آج کل بھی بعض مرد اور اس کے خاندان کے لوگ بچیوں کی پیدائش پر آزردگی کا اظہار کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں اس طرح کی سوچ کی مذمت فرمائی گئی ہے۔ (الزخرف:۲)

شریعت میں لڑکیوں کی پرورش اور اس کی تمام ضروریات کی تکمیل اس وقت تک باپ کے ذمہ رکھی ہے جب تک کہ اس کی شادی نہ ہو جائے۔ لڑکے بالغ ہو جائیں، تو

والدین اکثر حالات میں اس کے اخراجات کا ذمہ دار نہیں رہتے، لیکن لڑکیوں کے بالغ ہونے کے بعد بھی ان کے اخراجات اس وقت تک باپ پر واجب ہیں جب تک کہ شادی نہ ہو جائے اور وہ سسرال نہ چلی جائے۔ (عالمگیری ۱/۵۶۳) پھر یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کی پرورش میں والدین کے لئے جائز نہیں کہ وہ لڑکوں کے ساتھ ترجیحی سلوک کریں اور لڑکیوں کے ساتھ کم تر درجہ کا سلوک۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جن کو لڑکی ہو، وہ اس کو زندہ باقی رکھے، اس کے ساتھ حقارت کا معاملہ نہ کرے اور لڑکوں کو اس پر ترجیح نہ دے، تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرمائے گا۔ (ابوداؤد ۲/۷۰۷)

بالغ ہونے کے بعد ماں باپ اور خاندان کے بڑوں کو اس بات کی اجازت نہیں کہ لڑکی کی رضامندی کے بغیر اس کا نکاح کر دیں اور اس پر اپنی پسند کو تھوپیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس بات کو ضروری قرار دیا کہ نکاح میں لڑکیوں کی رضامندی دریافت کی جائے۔ (بخاری: ۲/۱۷۷) ایک خاتون نے آپ ﷺ کی خدمت میں شکایت کی کہ ان کے والد نے ان کی اجازت کے بغیر نکاح کر دیا ہے، آپ ﷺ نے اس نکاح کو رد فرمادیا۔ (بخاری ۲/۱۷۷) اگر نابالغی کی حالت میں باپ دادا کے علاوہ کسی اور سرپرست نے نکاح کر دیا ہو، یا باپ دادا ہی نے کیا ہو، لیکن وہ معاملات کی ناتجربہ کاری میں معروف ہوں، تو بالغ ہونے کے بعد لڑکی کو اس نکاح کے رد کر دینے کا حق حاصل ہے۔

زندگی میں اگر والدین اپنی جائداد بچوں میں تقسیم کر کے ان کے حوالہ کر دینا چاہیں، تو واجب ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو برابر حصہ دیں، اسی طرح اگر والدین کے زیر پرورش رہتے ہوئے کوئی شخص رقم یا جائیداد ہبہ کرے، تو لڑکی خود اس کی مالک ہوگی اور والدین وغیرہ کو لڑکی کی اجازت کے بغیر اس میں تصرف کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہوگا۔ والدین کی وفات کے بعد جائداد میں شریعت نے لڑکیوں کا بھی حصہ رکھا ہے اور یہ حصہ لڑکوں کے مقابلے آدھا ہے۔ چوں کہ ماں باپ، بال بچے، نابالغ بھائی بہن، مطلقہ اور بیوہ بہنیں اور خاندان کے دوسرے نادار ومحتاج رشتہ دار، مثلاً چچا، پھوپھی، بھتیجے، بھتیجیاں، بھانجے، بھانجیاں وغیرہ کی پرورش کی ذمہ داریاں عام طور پر مردوں ہی پر رکھی گئی ہیں، اس لئے بیٹے کا

حصہ بہ مقابلہ بیٹی کے دوگنہ رکھا گیا ہے۔

اگر بھائی کا انتقال ہوا، جو لاولد تھا اور اس نے تنہا ایک بہن کو چھوڑا، تو وہ نصف جائداد کی حقدار ہوگی، اگر صرف دو بہنیں تھیں، تو ایک ایک تہائی دونوں کا حصہ ہوگا اور اگر اس کے بھائی بھی ہیں، تو بھائی کے مقابلہ نصف حصہ بہنوں کو ملے گا، اس طرح مختلف رشتہ داروں سے بہت حصہ وراثت پاتی ہے۔

بیوی: شریعت میں بیوی کو کافی حقوق دیئے گئے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپ نے بیوی کے ساتھ بہتر سلوک کو کسی مرد کے بہتر ہونے کا معیار قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں بہترین شخص وہ ہے جس کا سلوک اپنی بیوی کے ساتھ بہتر ہو اور میں اپنی بیوی کے ساتھ تم سب کے مقابلہ بہتر سلوک رکھتا ہوں۔

(ترمذی، ابن ماجہ، دارمی، مشکوٰۃ: ۲/۲۸۱)

بیوی اپنی تمام جائداد اور سامان کی خود ہی مالک ہے، اس کو اپنے والدین کی طرف سے میراث یا تحفہ کے طور پر جو کچھ ملے، وہ اس کی ملکیت ہے، اسی طرح شادی کے وقت یا اس سے پہلے اور اس کے بعد شوہر یا اس کے اہلِ خاندان نے تحفتاً عورت کو جو کچھ دیا ہو، وہ سب اس کی ملک ہے، شوہر اس کی واپسی کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ ان تمام چیزوں میں عورت ہر طرح کا تصرف کر سکتی ہے، شوہر یا دوسرے اہلِ خاندان اس کو روک نہیں سکتے۔

بیوی کا نفقہ یعنی کھانے، پینے، دوا علاج اور کپڑے وغیرہ کی تمام ضروریات شوہر کے ذمہ ہے، چاہے بیوی بذاتِ خود خوش حال ہو اور مرد تنگ دست ہو، پھر بھی نفقہ شوہر پر واجب ہوگا (البحر الرائق: ۴/۱۸۸) اگر بیوی شوہر کے بے جا ظلم سے بچنے کے لئے یا اپنے کسی جائز حق کے مطالبہ کے لئے اپنے میکہ میں رہے، تو میکہ میں رہنے کے باوجود اس کے اخراجات شوہر پر واجب ہوں گے۔ (عالمگیری: ۱/۵۴۵) کھانے، پینے، رہائش اور لباس و پوشاک میں شوہر پر واجب ہوگا کہ بیوی کے اہلِ خاندان کی رعایت کرے: مثلاً اگر کسی شخص کے یہاں رہنے سہنے کا معیار کمتر ہے اور اس کے سسرال میں معیار زندگی اونچا ہے تو وہ عورت کے لئے درمیانی درجہ کا معیار فراہم کرے۔ (ہدایہ: ۲/۴۱۷) بیوی اگر

صاحب جائیداد بھی ہو، تب بھی بال بچوں کے اخراجات شوہر پر ہی واجب ہوں گے۔ اگر شوہر معاشی اعتبار سے خوش حال ہو تو اس پر یہ بھی واجب ہے کہ بیوی کی امور خانہ داری میں مدد کے لئے نوکر یا نوکرانی کا انتظام کرے۔ (ہدایہ: ۲/۴۱۹) اگر شوہر بیوی کے اخراجات نہیں ادا کرسکتا ہو یا صلاحیت رکھنے کے باوجود ادا نہیں کرتا ہو تو عورت کو حق ہے کہ وہ قاضی شریعت سے رجوع کر کے اپنا نکاح توڑ والے۔

اگر بیوی سسرال کے لوگوں کے ساتھ رہنے پر آمادہ نہ ہو، تو اس کو علاحدہ مکان کے مطالبہ کا حق حاصل ہے اور اگر ایسا کرنا مصلحت کے خلاف نہ ہو تو شوہر کو اس کا پورا کرنا واجب ہے۔ (ہدایہ: ۲/۴۲۱) شوہر کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ بیوی کے والدین یا اس کے محرم رشتہ داروں کو آنے سے منع کرے۔ (ہدایہ: ۲/۴۲۱) اگر وہ خود والدین یا دوسرے محرم رشتہ داروں سے ملنا چاہے تو اس کو اس کا حق حاصل ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ اگر اس کا میکہ شہر میں ہے، تو ہفتہ میں ایک دن والدین کے یہاں اور مہینہ میں ایک دن دوسرے محرم رشتہ داروں سے ملاقات کے لئے جاسکتی ہے اور شوہر کو کسی معقول عذر کے بغیر اس سے نہیں روکنا چاہئے۔ (عالمگیری: ۲/۱۴۸) البتہ غیر محرم مردوں سے ملنا سخت منع اور گناہ ہے۔

بیوی کو گالی گلوچ کرنا، اس کی صورت یا کسی اور بات پر طنز کرنا حرام اور سخت گناہ ہے۔ قرآن مجید نے بیوی کے ساتھ حسنِ سلوک کی خاص تاکید کی ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اگر تم کو اس میں کوئی خامی نظر آئے تو یہ سمجھ کر نظر انداز کرو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے والدین کی طرح اس میں کوئی بڑی بہتری بھی پیدا کرسکتا ہے (النساء: ۱۹) شریعت میں والدین کی طرح شوہر سے بیوی کو بھی میراث ملتی ہے۔ اگر شوہر صاحب اولاد ہو تو بیوی کو اس کی چھوڑی ہوئی جائیداد کا آٹھواں (۱/۸) حصہ ملے گا اور وہ لاولد ہو تو چوتھائی حصہ (۱/۴)۔ (نساء: ۱۲)

بیوی کا ایک نہایت اہم حق ''مہر'' ہے، یہ اتنا اہم حق ہے کہ اگر نکاح مہر نہ دینے کی شرط پر ہوا ہو، تب بھی مہر واجب ہو کر ہی رہے گا۔ قرآن مجید نے مہر ادا کرنے کی خصوصی تاکید کی ہے (نساء: ۴) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے نکاح کیا اور مہر ادا کرنے کا ارادہ نہیں تھا، تو ایسا شخص زانی ہے (مجمع الزوائد: ۴/ ۲۸۴)

بیوی کے حقوق میں یہ بھی ہے کہ اگر کسی جائز شرعی ضرورت کی بنا پر مرد دوسرا نکاح کرے، تو دونوں بیویوں کے درمیان مکمل عدل و انصاف سے کام لیا کرے۔ لباس و پوشاک، کھانے پینے کے سامان اور رات گذارنے کے اعتبار سے پوری طرح برابری برتی جائے۔ بیویوں کے درمیان انصاف نہ کرنا حرام اور سخت گناہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسے شخص کی بڑی مذمت فرمائی ہے۔ قرآن مجید نے کہا ہے کہ اگر کوئی شخص دو بیویوں کے درمیان انصاف کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہو تو اس کے لئے دوسری شادی کرنا جائز نہیں۔ (نساء:۳)

بیوہ و مطلقہ: بیوہ اور مطلقہ عورتوں کو شریعت نے نہ صرف نکاح کی اجازت دی ہے، بلکہ اس کی ترغیب بھی دی ہے، خود قرآن مجید نے اس کی طرف متوجہ کیا ہے (نور:۴) اور اس سے بھی منع کیا گیا ہے کہ اگر وہ خود نکاح کرنا چاہیں، تو اس میں رکاوٹ بنا جائے۔ (بقرہ:۲۳۲) خود رسول اللہ ﷺ نے کل گیارہ نکاح فرمائے، جن میں سے دس نکاح بیوہ اور مطلقہ خواتین سے کئے۔

ایسی خواتین کو شریعت نے بے سہارا نہیں چھوڑا ہے، بلکہ والدین اور دوسرے محرم رشتہ داروں پر ان کی کفالت واجب قرار دی ہے۔ (ہدایہ:۲/۴۲۶) اور یہ کوئی احسان اور اخلاقی حق نہیں بلکہ ایسی عورتوں کا قانونی حق اور محرم رشتہ داروں پر شرعی فریضہ ہے۔ یہ بات خاص طور پر پیش نظر رکھنی چاہئے کہ اگر بیوی کا مہر ادا نہ کیا ہو اور شوہر کا انتقال ہو جائے، تو شوہر کے متروکہ میں سے اولاً بیوی کا مہر ادا کرنا واجب ہے اور شوہر کے انتقال کے بعد جنازہ کے سامنے بیوی سے مہر معاف کروانا نہ جائز ہے اور نہ اس کا اعتبار ہے۔ ورثہ کو چاہئے کہ اولاً بیوہ کا مہر ادا کرے، پھر جو بچ رہے، اس کو حکم شرعی کے مطابق تمام ورثہ میں تقسیم کرے۔

مطلقہ عورت کو شریعت نے یہ خصوصی حق دیا ہے کہ لڑکیاں جب تک بالغ نہ ہو جائیں اور لڑکے سات، آٹھ سال کی عمر کو نہ پہنچ جائیں اور اپنی ضروریات (یعنی کھانے، پینے، استنجاء وغیرہ) خود پوری کرنے کے لائق نہ ہو جائیں، ماں ان کی پرورش کرے گی اور ماں

کا نکاح ہو جائے تو نانی کو حق پرورش حاصل ہوگا اور جب تک بچے زیرِ پرورش رہیں گے، ان بچوں کا نفقہ تو باپ کے ذمہ رہے گا ہی، پرورش کرنے والی خاتون کی اجرت بھی اس کے ذمہ واجب ہوگی۔ اس طرح جو مطلقہ عورتیں صاحبِ اولاد ہوں، طلاق کے بعد عرصہ تک اس ذریعہ سے ان کی ضروریات کی تکمیل ہو سکتی ہے۔

ماں: قرآن وحدیث میں سب سے زیادہ جن لوگوں کے حقوق کی تاکید زیادہ وارد ہوئی ہے، وہ والدین ہیں اور والدین میں بھی ماں کا درجہ زیادہ رکھا گیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔ (مشکوۃ: ۴۲۱/۲) ایک شخص نے دریافت کیا: ہمارے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ماں، وہ تین بار یہ سوال دہراتے رہے، آپ ﷺ نے تین دفعہ ماں اور چوتھی دفعہ باپ کا ذکر فرمایا۔ (ابوداؤد: ۷۰۰/۲،۷۹۹) قرآن مجید میں بھی ماں کے حقوق واحسانات خاص طور پر ذکر فرمایا۔ (لقمان: ۱۴، احقاف: ۲) اگر ماں حاجت مند ہو تو اس کی کفالت اولاد پر واجب ہے (ہدایہ: ۲۶۶/۱) یہاں تک کہ اگر ماں مسلمان نہ ہو تب بھی اس کا نفقہ ادا کرنا واجب ہے اور اگر وہ خود صاحب جائداد اور مالی اعتبار سے خود مکتفی ہو، تب بھی اولاد کو چاہئے کہ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کچھ اس کی خدمت میں پیش کیا کرے۔ یہ بھی اولاد کا فریضہ ہے کہ نہ ماں کی طرف سے بیوی پر ظلم ہونے دے اور نہ بیوی کی طرف سے ماں پر۔ ماں کے اخراجات کی کفالت کے علاوہ ان کا اکرام، ان کی خدمت اور جائز باتوں میں ان کی اطاعت واجب ہے۔ اگر ماں کسی ناجائز بات کا حکم دے، تو اس کا ماننا جائز نہیں بلکہ خوش اسلوبی سے ماں کو سمجھا دینا چاہئے، مثلاً جہیز لینے کا مطالبہ کرے، بلا وجہ بیوی کو طلاق دینے کا مطالبہ کرے تو ایسی باتوں کا ماننا جائز نہیں۔

اگر زندگی میں اولاد کا انتقال ہو جائے تو اس کی چھوڑی ہوئی جائیداد یا حادثاتی موت کی صورت میں سرکار سے ملنے والی امداد میں ماں کا بھی حصہ ہوگا۔ اگر مرنے والے کے بال بچے ہیں تو چھٹا حصہ اور اگر بال بچے نہیں ہیں لیکن بھائی ہیں، تو بھی چھٹا حصہ ملے گا اور مرنے والے کے بچے بھی نہ ہوں اور بھائی بھی نہ ہوں تو ایک تہائی ماں کا حصہ ہوگا۔

ان وضاحتوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے سماجی زندگی میں عورتوں کے حقوق کی کس درجہ رعایت کی ہے کہ ایک طرف ان کو تمام مالی ذمہ داریوں سے آزاد رکھا گیا ہے اور دوسری طرف خود ان کی مالی ذمہ داریاں باپ، شوہر، بیٹے اور بھائی کے ذمہ رکھی گئی ہیں اور ان رعایتوں کے ساتھ ساتھ ان کو قریب قریب ان تمام رشتہ داروں کا وارث بھی مانا گیا ہے جن سے مردوں کو میراث ملتی ہے اور مہر کی ایک خطیر رقم بھی شوہر سے دلائی گئی ہے، مغربی معاشرہ کی طرح عورتوں کو کمانے اور ملازمت کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اس کی لطافت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کو گھر کی ملکہ کا درجہ دیا گیا ہے۔ افسوس کہ بعض حقیقت ناآشنا لوگ عورتوں کے لئے اس کو قید سمجھتے ہیں، حالاں کہ یہ قید نہیں، بلکہ ان کا تحفظ ہے اور مردوں کو "قوام" (النساء:۳۴) قرار دیئے جانے کا مطلب بھی یہی ہے کہ وہ خاندان کی ضروریات کا ذمہ دار اور اس کا محافظ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے سماجی قوانین میں عدل بھی ہے، انصاف بھی ہے، اعتدال بھی ہے اور توازن بھی اور انسانی فطرت سے ہم آہنگی اور مرد و عورت کی صلاحیت کی پوری پوری رعایت بھی۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی اس سے انحراف اور بغاوت کا راستہ اختیار کیا گیا ہے، وہاں عدل وانصاف کے تقاضے مجروح ہوئے، خاندان بکھر گئے اور عورتوں کو آزادی کے نام پر سر بازار رسوا کرنے کا اور سامانِ لذت وہوس بنانے کی ایک مکارانہ تدبیر کی گئی ہے۔

" اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ "

(۵ مارچ ۱۹۹۹ء)

کم عمری کی شادی

آج کل پریس کو مسلمانوں کے خلاف ہمیشہ کسی نئے مسئلہ کی تلاش رہتی ہے، جس کو بغیر کسی مناسب تحقیق اور جانکاری کے خوب پھیلایا جاتا ہے، اور زہر افشانی کی جاتی ہے ان ہی مسائل میں ایک شادی کی عمر کا مسئلہ ہے، ہندوستان میں طویل عرصہ سے یہ مسئلہ زیرِ بحث رہا ہے، برطانوی عہد میں ۱۹۲۹ء میں شاردا ایکٹ بنا، جس کے خلاف پورے ملک میں مسلمانوں نے آواز اٹھائی، اور جمیعۃ علماء دیوبند کے زیرِ اہتمام ''تحفظ ناموس شریعت'' کے نام سے ملک گیر تحریک چلائی گئی۔

آزادی کے بعد مختلف ریاستوں نے اس طرح کے قانون بنائے ہیں، جن میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے نکاح کی کم سے کم عمر ۱۸ رسال مقرر کی گئی ہے، اس وقت اسی نوعیت کا ایک مقدمہ سپریم کورٹ میں چل رہا ہے، جس میں ۱۷ رسال کی عمر میں ایک لڑکی کی شادی ہوئی ہے، یہ مسئلہ چوں کہ مسلم پرسنل لاء سے بھی متعلق ہے، اس لئے آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ نے اس میں فریق بننے کی درخواست کی ہے۔

جو لوگ شادی کے لئے ایک مخصوص عمر متعین کرنا چاہتے ہیں ان کا خیال ہے کہ کم عمری کی شادی لڑکیوں کی صحت کے لئے نقصان دہ ہے، کہ جسمانی نشو ونما کی تکمیل اور تولید کی مناسب صلاحیت پیدا ہونے سے پہلے ہی ان کو ماں بننا پڑتا ہے، جس سے ان کی صحت پر منفی اثر پڑتا ہے، اس سلسلہ میں کئی باتیں قابلِ غور ہیں۔

اول یہ کہ جسمانی نشو ونما تمام لڑکوں اور لڑکیوں میں یکساں طور پر نہیں ہوتا، موسمی حالات، غذا، ماحول اور موروثی اثرات کے تحت بلوغ کی عمر مختلف ہوتی ہے، اور جسمانی قویٰ اور تولید کی صلاحیت میں بھی فرق ہوتا ہے، نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸ رسال سے کم عمر

کی ہر لڑکی کے لئے ماں بننا نقصان دہ ہے، اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸؍سال کے بعد لڑکیوں میں لامحالہ ایسی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ ماں بننا ان کی صحت کے لئے مضرت رساں نہ ہو، اس لئے ۱۸؍سال ہی کی تعیین قابلِ فہم نہیں، قانونِ فطرت کے تحت عورت کی اس صلاحیت کا اصل معیار وہی ہے کہ جب وہ بالغ ہو جاتی ہے تو اس میں بنیادی طور پر حاملہ ہونے کی صلاحیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

دوسرا قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ اس وقت ٹی وی کے فروغ، فحش رسائل کی کثرت، انٹرنیٹ اور بیہودہ فلموں کے ویڈیو اور ان فلموں تک کم عمر لڑکوں کی رسائی کی وجہ سے صورتِ حال یہ ہے کہ نابالغ بچے تک جنسی بے راہ روی میں مبتلا ہو رہے ہیں، شادی سے پہلے ناجائز اسقاطِ حمل کی کثرت ہوگئی ہے، سوال یہ ہے کہ کم عمری کا نکاح زیادہ نقصان دہ ہے یا کم عمری کے جنسی تجربات؟ یقیناً بے قید جنس پرستی زیادہ مضر ہے، تو اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ ماں باپ اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کے اخلاق و کردار کی حفاظت کے لئے بلوغ کے بعد جلد سے جلد ان کا نکاح کر دینا مناسب سمجھتے ہوں تو کیا یہ بات مناسب نہیں ہوگی کہ انہیں اس عمر سے پہلے ہی نکاح کی اجازت دی جائے؟ تاکہ وہ اپنے بچوں کو فساد اور بگاڑ کے گڑھے میں جانے سے بچا سکیں، اصل مسئلہ Child Marraige کا نہیں، بلکہ Child sex کا ہے، حکومت کو اور سماجی تنظیموں کو چاہئے کہ یہ جو بے راہ روی کا طوفان ملک میں آرہا ہے، اور ہماری تعلیم گاہوں کو اپنا ہدف بنا رہا ہے، پہلے اس کے سدِ باب کی کوشش کریں۔

تیسری بات یہ ہے کہ کم سنی کے نکاح کے واقعات اب خود ہی کم ہوتے جا رہے ہیں، چودہ پندرہ سال کی عمر میں تو لڑکے اور لڑکیاں میٹرک کرتے ہیں، اب لڑکوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں میں بھی اعلیٰ تعلیم کا رجحان روز افزوں ہے، اور تعلیم کے درمیان عام طور پر شادی نہیں کی جاتی، لڑکوں کے لئے تو تعلیم کے بعد حصولِ روزگار کا بھی مسئلہ ہے، اس لئے اس تلاشِ روزگار میں کئی سال نکل جاتے ہیں، اور اس کے بعد ہی لڑکے شادی کی طرف راغب ہوتے ہیں، اس طرح قانون میں جو عمر متعین کی گئی ہے، عام طور پر اس سے

کہیں زیادہ عمر میں لڑکوں اور لڑکیوں کی شادیاں ہوتی ہیں، جوں جوں تعلیم بڑھتی جائے گی خود ہی کم سنی میں نکاح کا رجحان کم ہوتا جائے گا، اور جب تک تعلیم عام نہ ہوگی صرف قانون کے ذریعہ اس مقصد کو حاصل نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ ایسی شادی کے واقعات شہر میں بہت کم پیش آتے ہیں، زیادہ تر دور دراز دیہاتوں میں اس طرح کا رواج پایا جاتا ہے، اور اس کی نوبت بہت کم آتی ہے کہ وہ معاملات عدالت کے سامنے آئیں اس لئے وہ قانون کے دائرہ سے باہر ہی رہتا ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے فریق بننے کی وجہ سے اسے مسلم مسئلہ کی نظر سے دیکھا جارہا ہے، حالاں کہ کم سنی کی شادی کے واقعات مسلمانوں میں بہت کم ہیں، خود ہندوؤں میں ان سے کہیں زیادہ ہے، راجستھان میں اب بھی اکھا تیج کے موقع پر ہزاروں شیرخوار لڑکیوں کی شادی کر دی جاتی ہے، راجستھان مدھیہ پردیش، اڑیسہ اور ہریانہ وغیرہ کے بعض علاقوں میں ہندو سماج میں بہت ہی کم سنی میں نکاح کا رواج پایا جاتا ہے اور اس کا تناسب مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہے، اصل مسئلہ ان رواجات کو روکنا ہے، بالخصوص اس پس منظر میں کہ ہندو معاشرہ میں نکاح کے معاملہ میں لڑکی کی رضامندی اور ناراضگی کو بہت کم اہمیت دی جاتی ہے، اور ان پر رشتے تھوپ دیئے جاتے ہیں، خاص کر کم عمری میں کئے گئے نکاح میں، ظاہر ہے کہ اصل عاقدین کا کوئی حصہ نہیں ہوتا، اسلام میں اکثر حالات میں نابالغی کے نکاح کی صورت میں بالغ ہونے کے بعد لڑکے کو خیارِ بلوغ حاصل ہوتا ہے، اور وہ اس نکاح کو رد کر سکتا ہے۔

ہندو معاشرہ میں نکاح کے سلسلہ میں اور بھی قابلِ اصلاح رسوم ہیں، آج بھی ستی کے واقعات سننے کو ملتے ہیں، آج بھی ہزاروں خواتین بھگوان کی مورتیوں سے بیاہ دی جاتی ہیں، اور بھگوان کی آڑ میں سنت اور مہنت ان کو اپنی ہوس کا سامان بنائے رہتے ہیں، بلکہ بعض قبائل اور علاقوں میں چند شوہری کے واقعات بھی ملتے ہیں، اصل میں ایسی سماجی برائیوں کی اصلاح کی طرف ذرائع ابلاغ کو متوجہ ہونا چاہئے کہ یہ زیادہ قابلِ اصلاح ہیں۔

پانچویں بات یہ ہے کہ اس سلسلہ میں اسلامی نقطۂ نظر کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے، ایسا نہیں ہے کہ اسلام میں کم سنی اور نابالغی کے نکاح کو زیادہ بہتر قرار دیا گیا ہے، مسلم معاشرہ میں ہمیشہ سے یہ معمول رہا ہے کہ لڑکے اور لڑکیوں کے بالغ ہونے کے بعد ہی ان کا نکاح کیا جاتا ہے، خود قرآن مجید نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے، کہ یتیموں کو آزماؤ، جب وہ نکاح کو پہنچ جائیں، اور تم ان سے ہوش مندی محسوس کرو تو ان کا مال ان کے حوالہ کردو، وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰىٓ اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ، فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ (النساء:٦) ___ نکاح کو پہنچنے سے مراد بالغ ہونا ہے، چنانچہ امام ابوبکر جصاص رازیؒ فرماتے ہیں، **هو بلوغ حال النكاح من الاحتلام** (احکام القرآن:۲/۶۳) اور مشہور مفسر علامہ جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں: **أي صاروا محلاله بالاحتلام**، (جلالین: ۷۰) یعنی نکاح کو پہنچنے سے مراد یہ ہے کہ وہ احتلام کی وجہ سے نکاح کا اہل ہو جائے۔

ان آیات سے واضح ہے کہ بہتر طریقہ یہی ہے کہ بالغ ہونے کے بعد لڑکوں اور لڑکیوں کے نکاح کئے جائیں، پھر اسلام میں رشتہ کے انتخاب کی جو آزادی عاقدین کو دی گئی ہے، اور اس سلسلہ میں لڑکوں کی طرح لڑکیوں کو بھی اپنی ذات کے بارے میں فیصلہ کرنے کا جو اختیار دیا گیا ہے، اس کا تقاضا بھی یہی ہے، کیوں کہ بالغ ہونے کے بعد ہی وہ قانوناً اس اختیار کو استعمال کرنے کے اہل ہوں گے اور اس عمر کو پہنچنے کے بعد ہی انسان کے اندر بھلے اور بُرے کی تمیز بھی پیدا ہوتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے بالغ ہونے سے پہلے بھی نکاح کی گنجائش رکھی ہے، اور مختلف صحابہ نے کم عمری میں بچوں کے نکاح کئے ہیں، حضرت قدامہ بن مظعونؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عروہ بن زبیرؒ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عمرؓ، اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وغیرہ سے نابالغی کی عمر میں بچوں اور بچیوں کا نکاح کرنا یا نابالغی کے نکاح کے جائز ہونے کی صورت منقول ہے، خود رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت عائشہؓ سے نکاح کیا تو وہ نابالغ تھیں، اور یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی چچا زاد بہن حضرت حمزہؓ کی صاحبزادی کا نکاح

حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ سے اس وقت کیا جب وہ نابالغہ تھیں، چنانچہ ابن شبرمہؒ اور ابن اصمؒ کے علاوہ تمام محدثین، اور فقہاء نکاحِ نابالغاں کے جواز کے قائل رہے ہیں، اس لئے یہ فقہاء اسلام کے درمیان ایک اجماعی مسئلہ ہے، مشہور حنفی فقیہ علامہ سرخسی نے اس سلسلہ میں تفصیل سے صحابہ کے آثار اور فقہاء کے اقوال ذکر کئے ہیں،

(تفصیل کے لئے دیکھئے: مبسوط: ۱۴/۱۴-۱۲)۔

یہ اجازت اس لئے دی گئی ہے کہ بعض دفعہ مصلحت کا تقاضا یہی ہوتا ہے، ان میں دو مصلحتیں تو بہت ہی بنیادی ہیں، ایک یہ کہ بعض اوقات اخلاقی بگاڑ کا اندیشہ ہوتا ہے، نکاح کی وجہ سے ایک جائز راہ کھل جاتی ہے، اور یہ بات اسے ناجائز رُخ پر جانے سے بچاتی ہے، اگر ایسے حالات سامنے ہوں اور ۱۸ سال تک نکاح کو روکے رکھا جائے تو اس سے بہت سے اخلاقی مفاسد پیدا ہوسکتے ہیں، اور یہ اخلاقی بگاڑ بیک وقت صحتِ جسمانی کے لئے بھی مضر ہے، اور ساتھ ہی ساتھ سماج کے دوسرے لوگ بھی اس سے متأثر ہوتے ہیں، کیوں کہ کوئی شخص جب اخلاقی مفاسد کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کے لئے سماج ہی میں اپنی غذا تلاش کرتا ہے، اسلام میں حفاظت اخلاق کی بڑی اہمیت ہے، اور والدین بھی اس سلسلہ میں جوابدہ ہیں، چنانچہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کو بچہ ہو، تو اسے چاہیے کہ اس کا اچھا نام رکھے، اور اس کی تربیت کرے پھر جب وہ بالغ ہوجائے تو اس کا نکاح کردے، اگر بالغ ہونے کے باوجود اس کا نکاح نہیں کیا، اور وہ گناہ میں مبتلا ہوگیا تو اس کے باپ پر بھی اس کا گناہ ہوگا فإنما إثمه على أبيه (مشکوۃ ۲۷۱، کتاب النکاح)

دوسری اہم مصلحت یہ ہے کہ بعض دفعہ باپ لبِ گور ہوتا ہے، ظاہری حالات کے تحت اندیشہ ہے کہ اس کے بچوں کو یتیمی کا داغ لگنے والا ہے، اور اس کی موت کے بعد خاندان میں ایسے ذمہ دار اور دیانت دار لوگ نہیں ہیں، جن سے اُمید رکھی جاسکے، کہ وہ صحیح طور پر بچوں کی تربیت کرسکیں گے، اور مناسب رشتہ تلاش کرکے اس کے بے سہارا بچوں کی شادی کریں گے، ابھی بچے نابالغ ہیں، لیکن ایک موزوں اور مناسب رشتہ ہاتھ آرہا ہے، تو

ایسی صورت میں یقیناً مصلحت یہی ہے کہ اس وقت اس کا نکاح کر دیا جائے کہ اس میں اس کے لب گور سرپرست کے لئے سکون قلب بھی ہے، اور اس کے بچوں کے مستقبل کے محفوظ ہونے کی اُمید بھی۔

یقیناً یہ مصلحتیں ایسی نہیں ہیں، جنہیں نظر انداز کر دیا جائے، اس لئے قانون ایسا بنانا چاہئے جس میں مفادات کو حاصل بھی کیا جائے اور نقصانات سے حفاظت بھی ہو، یہ کہا جاسکتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہونابالغی کے نکاح سے بچا جائے، اگر باپ اور دادا کے علاوہ دوسرے اولیاء نکاح کریں یا باپ یا دادا ہی نکاح کریں، لیکن وہ اپنے اختیارات کا صحیح استعمال کرنے کے اہل نہ ہوں، تو بالغ ہونے کے بعد لڑکوں اور لڑکیوں کو اس نکاح کے باقی رکھنے یا ختم کر دینے کا اختیار دیا جائے، یہ حدود و قیود جن کی اسلام میں پہلے سے رعایت ہے، اگر ملحوظ ہو تو اس میں کم سنی کے نکاح کی مضرتوں سے بچا بھی جاسکتا ہے، اور اس کی مصلحتیں حاصل بھی کی جاسکتی ہیں، یہی اعتدال اسلام کا اصل امتیاز اور اس کی شناخت ہے۔

(۲۰ر ستمبر ۲۰۰۲ء)

تعدد ازدواج کا مسئلہ

ابھی چند دِنوں پہلے اخبارات میں یہ خبر پڑھنے کو ملی کہ ایک خاتون نے سپریم کورٹ میں مسلم پرسنل لا کے تحت تعدد ازدواج کی اجازت کے خلاف دعویٰ دائر کیا ہے، تعدد ازدواج کا مسئلہ ان سماجی مسائل میں سے ہے جو آزادیِ نسواں کی تحریک کے بعد سے پوری دنیا میں زیرِ بحث رہا ہے، اور اسلام کے معاشرتی قوانین کے خلاف اہلِ مغرب کی طرف سے جو فردِ جرم عائد کی جاتی رہی ہے ان میں یہ مسئلہ سرفہرست ہے، انسان کی ایک فطری کمزوری یہ ہے وہ جس بات کو بار بار اور مختلف زبانوں سے سنتا ہے خواہ وہ کتنی ہی غلط بات ہو اس کو درست سمجھنے لگتا ہے، چنانچہ تعدد ازدواج کے مسئلہ پر مغربی دنیا نے اتنا لکھا اور کہا ہے کہ بہت سے مسلمان بھی اس سلسلہ میں تنگ و تذبذب میں مبتلا ہیں، اور جن لوگوں نے مغربی ماحول میں یا مغربی نظام کے تحت تعلیم حاصل کی ہے وہ بے چارے تو اس مسئلہ پر اتنے شرمسار ہو جاتے ہیں کہ شاید عرقِ ندامت پیشانی سے گذر کر پاؤں کو جاتا ہو، اس لئے اس مسئلہ پر پوری حقیقت پسندی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے!

تعددِ ازدواج کا مسئلہ کئی پہلوؤں سے قابلِ غور ہے، مذہبی، سماجی اور اخلاقی۔ مذہبی اعتبار سے یہ ایک حقیقت ہے کہ تقریباً دنیا کے تمام مذاہب میں تعدد ازدواج کو جائز قرار دیا گیا ہے، ڈاکٹر مالک رام نے رگ وید (۱۰۸۱۰۔۱۰۵) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ایک مرد کے لئے بیک وقت ایک سے زیادہ نکاح کرنا درست ہے اور بیویوں کے لئے کوئی تحدید نہیں ہے، یہودی مذہب میں بھی تعدد ازدواج کی گنجائش ہے، چنانچہ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دو بیویاں تھیں، ایک حضرت صفورہ، جو حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی تھیں (استثناء ۱۰۲:۲۴) آپ کا دوسرا نکاح ایک کوسی خاتون سے ہوا تھا (استثناء ۲۴:۴) خود بائبل میں حضرت

داؤد علیہ السلام کی چھ بیویوں (اخنوعم، ابجیل، محلہ، حجیت، ابیطال، عجلاہ) کا ذکر آیا ہے (گنتی ۸:۲۷) عیسائی مذہب چونکہ اپنی اصل کے اعتبار سے تورات ہی کی شریعت پر ہے اس لئے سمجھنا چاہئے کہ اصلاً عیسائی مذہب میں بھی تعدداز دواج کی اجازت ہے، چنانچہ شیخ محمود عقاد نے لکھا ہے کہ سترہویں صدی تک خود اہلِ کلیسا نے تعدداز دواج کی حمایت کی ہے، فرماتے ہیں:

> مختلف انسانی نظام ازدواج کی تاریخ کا مستند عالم وسٹر مارک (Vister marc) نے بیان کیا ہے کہ کلیسا اور حکومت دونوں ہی سترہویں صدی کے نصف تک تعدداز دواج کو مباح قرار دیتے تھے اور ان کے یہاں بکثرت اس کا رواج تھا۔ (الفلسفۃ القرآنیہ:۵۴)

غرض دنیا کے مشہور مذاہب میں شاید ہی کوئی مذہب ہو جس نے تعدداز دواج کو جائز نہ رکھا ہو، اسلام نے بھی تعدداز دواج کی اجازت دی ہے، لیکن اس کے لئے بنیادی طور پر دو باتوں کی تحدید رکھی ہے، اول یہ کہ ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ چار تک ہی تعدد ازدواج کی اجازت ہے، دوسرے یہ اجازت عدل کے ساتھ مشروط ہے، یعنی جو شخص ایک سے زیادہ بیویوں کے درمیان حقوق کی ادائیگی اور سلوک و برتاؤ میں برابری کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، اسی کے لئے ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت ہے، پس اسلام نے ایک طرف سماجی ضرورت کی رعایت بھی کی ہے اور دوسری طرف ان حدود و قیود کے ذریعہ اس اجازت کو متوازن بنانے کی کوشش بھی کی ہے۔

دوسرا پہلو تعدداز دواج میں سماجی ضرورت کا ہے، عام طور پر لڑکوں اور لڑکیوں کی شرح پیدائش میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہوتا، لیکن شرح اموات میں مردوں کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے، کیوں کہ زیادہ تر حادثات میں مردوں کی جانیں کام آتی ہیں، مثلاً پہلی جنگِ عظیم جو ۱۹۱۴ سے ۱۹۱۸ تک جاری رہی، میں اسّی لاکھ صرف فوجی مارے گئے، شہریوں کی تعداد اس کے علاوہ ہے، ظاہر ہے کہ یہ فوجی مرد تھے، دوسری جنگ ۱۹۳۹ تا ۱۹۴۵ جاری رہی، جس میں کل ساڑھے چھ کروڑ آدمی یا تو ہلاک ہو گئے یا معذور، ان مہلوکین اور معذورین

میں غالب ترین اکثریت مردوں کی تھی، اس جنگِ عظیم میں برباد ہونے والا قائد ملک جرمنی تھا، ۱۹۲۰ سے ۱۹۴۰ تک جرمنی میں یہ کیفیت تھی کہ ہر مرد کے مقابلہ شادی کی عمر کو پہونچی ہوئی تین عورتیں ہوتی تھیں، فرانس میں ۱۹۰۰ء کی مردم شماری کے اعتبار سے عورتوں کی تعداد مردوں سے چار لاکھ، تیئیس ہزار، سات سونو سے زیادہ تھی، اور آسٹریا میں ۱۸۹۰ میں چھ لاکھ، چوالیس ہزار، سات سو، چھیانوے عورتیں مردوں سے زیادہ تھیں، عراق ایران جنگ (۱۹۸۸ـ۱۹۷۹) میں عراق کی ایک لاکھ اور ایران کی بیاسی ہزار عورتیں بیوہ ہوگئیں۔

جنگوں کے علاوہ جو دوسرے ٹریفک یا صنعتی حادثات پیش آتے ہیں اور جو لوگ غنڈہ گردی کا نشانہ بنتے ہیں وہ بھی عام طور پر مرد ہی ہوتے ہیں، پھر اگر جیلوں میں طویل المدت قیدیوں کا جائزہ لیا جائے تو ان میں نوے سے زیادہ تعداد مردوں کی ہوتی ہے، کیوں کہ طویل قید بھیانک جرائم پر ہوتی ہے، اور اپنی نفسیاتی کمزوری کی بنا پر مجرم ذہن کی عورتیں بھی بھیانک قسم کے جرائم کا حوصلہ نہیں پاتیں، ان اسباب کی بناء پر عام طور پر ایک مرد کے مقابلہ ایک سے زیادہ عورتوں کا تناسب پایا جاتا ہے، امریکہ جیسے ملک میں جس میں حادثات سے حفاظت کا زیادہ ترقی یافتہ نظام قائم ہے، اور دفاعی ٹیکنالوجی میں ترقی اور بالادستی کی وجہ سے حریف ملکوں کے مقابلہ اس کی فوجیوں کی ہلاکت کا تناسب بہت کم ہوتا ہے، ایک رپورٹ کے مطابق ۱۹۸۷ء میں وہاں عورتوں کی آبادی بمقابلہ مردوں کے تقریباً اسی لاکھ زیادہ تھی۔

ان حالات میں اگر تعدد ازدواج کی اجازت نہ دی جائے تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ خواتین کی ایک بڑی تعداد تجرد اور محرومی کی زندگی گذارے، اس لئے تعدد ازدواج مردوں کی ہوس اور نفسانی طمع کی تکمیل نہیں، بلکہ ایک سماجی ضرورت ہے۔

تعددِ ازدواج کے مسئلہ میں سب سے اہم پہلو اخلاقی ہے، عفت وعصمت انسانیت کا بنیادی جوہر ہے، گائے اور بیل، گھوڑے، گدھے اور ان کی مادہ کے درمیان کیا کبھی نکاح ہوا ہے؟ ظاہر ہے اس کا جواب نفی میں ہے، نر و مادہ کی تقسیم اور جنسی خواہش انسان

میں بھی ہے اور دوسرے حیوانات میں بھی۔لیکن یہ انسانی سماج کا امتیاز ہے کہ نکاح کے ذریعہ ایک مرد اور عورت رشتۂ ازدواج میں بندھ جاتے ہیں، اور ان کی وفاداریاں ایک دوسرے کے لئے محدود و مخصوص ہو جاتی ہیں، دوسری مخلوقات اس وفاداری سے نا آشنا ہے،اسی وفاداری کا نام "عفت وعصمت" ہے،عفت وعصمت انسان کی فطرت میں ہے اور ہر سلیم الفطرت شخص اس کا ادراک کرسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ انسان اپنی ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کے بارے میں برائی کی نسبت کو برداشت نہیں کرسکتا،تعدد ازدواج اس جوہر عفت کی حفاظت کا بہت بڑا ذریعہ ہے، دنیا کی تاریخ میں جب کبھی بھی قانونی تعدد ازدواج پر روک لگائی گئی ہے وہاں غیر قانونی تعدد ازدواج نے ضرور راہ پائی ہے،قدم تہذیبوں میں یونانی اور رومی تہذیب تعدد ازدواج کی مخالف تھی، ایڈورڈ ہارٹ پول لیکی (۱۸۳۸ء۔ ۱۹۰۳ء) نے یونانی تہذیب کے بارے میں لکھا ہے کہ مرد کے لئے ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت نہ تھی ،لیکن غیر قانونی داشتاؤں پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔

(تاریخ اخلاق یورپ،ص:۲۴۰،"ترجمہ دریابادی")

چنانچہ منصف مزاج غیر مسلم دانشوروں نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے،علم تمدن کے معروف عالم ڈاکٹر گستاولی مان لکھتے ہیں :

> مغرب میں بھی .... ایک ہی شادی کی رسم کا وجود صرف کتابوں ہی میں ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ کوئی شخص انکار نہ کرے گا کہ یہ رسم ہماری واقعی معاشرت میں نہیں پائی جاتی ہے، میں نہیں جانتا کہ مشرقیوں کا جائز تعدد کسی امر میں مغربیوں کی ناجائز تعدد ازدواج سے کمتر سمجھا جاتا ہے؟ بلکہ میں یہ کہوں گا کہ اول کو ہر طرح دوسرے پر ترجیح ہے،(تمدن عرب:۳٦٦)

جناب مالک رام، ملک کے حقیقت پسند اصحابِ دانش میں تھے، ان کا یہ اقتباس پڑھنے کے لائق ہے۔

تعدد ازدواج کی تائید میں متعدد دلائل پیش کئے جاسکتے ہیں، مثلاً

یہ کہ عام حالت میں دنیا میں عورتوں کی تعداد مردوں سے کہیں زیادہ ہے، اگر ایک مرد، ایک عورت کے اصول پر عمل کیا جائے تو ان زائد عورتوں کا کیا بنے گا؟ کیا ہم ان پر نکاح کا راستہ بند کر کے ان کی اور ان کے ساتھ شادی شدہ مردوں کی بھی گمراہی کا سامان تو پیدا نہیں کر رہے ہیں...... اگر آپ ان عورتوں کو نکاح کرنے کا موقع نہیں دیتے تو گویا انہیں قعرِ مذلت میں ڈھکیل رہے ہیں اور انہیں مجبور کر رہے ہیں کہ وہ گناہ کی زندگی بسر کریں، کیوں کہ یہ جذبہ فطری ہے، اگر عورت سماج کی اجازت سے اس کی تسکین نہیں کر سکے گی تو سماج کو دھتا بتائے گی اور گھونگھٹ کی اوٹ میں شکار کھیلے گی اس صورت میں آپ کو کسی اور حرام اولاد کا وجود قانوناً تسلیم کرنا پڑے گا، حقِ انتخاب آپ کو حاصل ہے، ایک طرف آپ اس عورت کو قابلِ عزت بیوی اور گھر کی مالکہ اور محترم ماں بنانے پر قادر ہیں، دوسری صورت میں وہ قابلِ نفرت داشتہ یا کسی خانما بردار اور اپنے اور تمام سماج کے لئے کلنک کا ٹیکا بننے پر مجبور ہے۔ (اسلامیات:۱۶۳،۱۶۱)

پس حقیقت یہ ہے کہ تعدد ازدواج کی گنجائش ایک عفیف و پاک دامن سماج کے لئے ضرورت کے درجہ میں ہے، اور یہ کوئی نظری فلسفہ نہیں، بلکہ مغرب کا عصمت باختہ سماج اس کی عملی مثال ہے۔

تعددِ ازدواج میں ایک پہلو عورت کے ساتھ رحم دلی کا بھی ہے، اگر ایک عورت دائم المریض ہو، صاحبِ اولاد اور کسی مناسب یا نامناسب وجہ سے مرد دوسرے نکاح پر مصر ہو تو اگر تعدد ازدواج کی گنجائش نہ رکھی جائے تو یا تو وہ اسے طلاق دے دے گا، جس کا مذموم ہونا ظاہر ہے یا وہ غیر قانونی تعدد ازدواج کا راستہ اختیار کرے گا، اور غیر قانونی بیوی قانونی بیوی سے زیادہ نقصان دہ ہوتی ہے، کیوں کہ وہ مرد کو زیادہ بلیک میل کرسکتی ہے، اور اپنے خنجرِ ناز سے قانونی بیوی کو گھائل کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتی ہے، ایسی صورتوں میں تعدد ازدواج رحمت ثابت ہوتی ہے نہ کہ زحمت، مطلقہ اور بیوہ خواتین کے مسائل کا حل اکثر یہی

تعدد ازدواج بنتا ہے، اور یہ تعدد ازدواج بھی دوسری بیوی کی رضامندی اور خوشنودی ہی سے وجود میں آتا ہے، کیوں کہ کسی عورت کو دوسری بیوی بننے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

اب عورتوں کو بھی اس بات کو سمجھنا چاہئے کہ جب عورتوں کی شرح آبادی مجموعی طور پر مردوں سے زیادہ ہے تو وہ بحیثیت عورت اپنی ان بہنوں کے لئے قانونی طور پر رشتۂ نکاح میں منسلک ہونا پسند کریں گی یا یہ بات کہ وہ وقتاً فوقتاً مختلف مردوں کی غیر قانونی بیوی بنتی رہیں؟ اور ان حقوق وفوائد سے بھی محروم رہیں جو ایک بیوی کو اپنے شوہر سے حاصل ہونے چاہئیں؟

تعددِ ازدواج کے مسئلہ میں ایک سے زیادہ نکاح کرنے والوں کا رویہ بھی قابلِ توجہ ہے، کہ ایک طرف وہ قرآن مجید کی اجازت سے فائدہ اٹھا کر دوسرا نکاح کرتے ہیں اور دوسری طرف قرآن ہی کی لگائی ہوئی عدل وانصاف کی شرط کو پس پشت ڈال دیتے ہیں، تعدد ازدواج ایک سنجیدہ فیصلہ ہے نہ کہ پہلی بیوی سے انتقام کا طریقہ، عوام تو عوام خواص اور اہلِ علم بھی جب دوسرا نکاح کرتے ہیں تو کھلے ہوئے ظلم و جور سے اپنا دامن آلودہ کر لیتے ہیں، اور زیادہ تر پہلی بیوی کو اور بعض واقعات میں دوسری بیوی کو معلقہ بنا کر رکھ دیتے ہیں، یہ صریحاً ظلم اور گناہِ عظیم ہے، اور اللہ کی شریعت سے کھلواڑ کرنے کے مترادف ہے، جو شخص عدل پر قادر نہ ہو اس کے لئے ایک ہی بیوی پر قناعت کرنا واجب ہے، ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا درست نہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ایک سے زیادہ بیویوں کے درمیان عدل نہیں کر سکو گے تو تمہیں ایک ہی بیوی پر اکتفا کرنا چاہئے ''فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً'' (النساء:۳)

اس لئے حقیقت یہ ہے کہ تعدادِ ازدواج کی اجازت ایک سماجی وعمرانی ضرورت اور عفت و پاک دامنی کی حفاظت کا ذریعہ ہے، اور اپنے نتائج واثرات کے اعتبار سے خود عورتوں کے لئے بعض حالات میں باعث رحمت ہے، البتہ یہ بات ضروری ہے کہ تعدد ازدواج کے لئے شریعت نے جو حدود و قیود مقرر کی ہیں ان کا لحاظ رکھا جائے ورنہ یہ قانون حکمِ شریعت کا استعمال نہیں بلکہ ''استحصال'' ہوگا۔

(۲۵رمئی ۲۰۰۱ء)

طلاق، اسلامی نقطۂ نظر

شریعت کی نگاہ میں نکاح ایک پاکیزہ، ٹھوس اور پائیدار رشتہ ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ جن دو مرد و عورت نے نکاح کی صورت میں ایک ساتھ زندگی بسر کرنے اور ایک دوسرے کے ساتھی بن کر رہنے کا عہد کیا ہے، وہ ہمیشہ اس پر قائم رہیں اور معمولی معمولی باتوں اور زندگی کی چھوٹی چھوٹی الجھنوں کی وجہ سے اس رشتہ کی مضبوط بنیادوں کو نہ ڈھادیں۔

قرآن مجید نے میاں بیوی کے رشتہ کو ایک دوسرے کے لئے ذریعۂ سکون بتایا ہے (الروم:۲۱) اور ایک کو دوسرے کے لئے لباس قرار دیا ہے کہ جس طرح لباس انسانی جسم کا سب سے بڑا ہمراز، تکلیف و آرام کا ساتھی اور محافظ ہے، اسی طرح میاں بیوی ایک دوسرے کے راز داں، ان کی باہمی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے والے اور ہر حال میں ان کے ساتھی اور رفیق ہیں۔

اسلام کی نگاہ میں اس رشتہ کو بڑی عظمت حاصل ہے، اس لیے کہ اس کی وجہ سے مرد و عورت میں عفت اور پاکدامنی پیدا ہوتی ہے، دو اجنبی خاندان ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں اور ان کے درمیان محبت و وابستگی پیدا ہو جاتی ہے، یہ تعلق نسل انسانی کی افزائش کا ذریعہ بنتا ہے۔

پھر اگر خدانخواستہ رشتہ ٹوٹا تو اپنے ساتھ اتنی ہی مضرتیں لاتا ہے، دو آدمی کی زندگیاں ویران ہو جاتی ہیں، بال بچوں کو باپ کی شفقت یا ماں کی ممتا میں سے کسی ایک سے محروم ہونا پڑتا ہے، ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت صحیح طور پر نہیں ہوتی، دو خاندان جس قدر ایک دوسرے سے قریب ہوئے تھے اب اتنی ہی دور ہو جاتے ہیں اور آپس میں سخت نفرت اور کدورت پیدا ہو جاتی ہے، اس لئے اسلام ابتدا ہی میں ایسے تمام دروازوں کو بند

کر دیتا ہے جو بعد میں باہمی نفرت، اختلاف اور ایک دوسرے سے دوری اور علیحدگی کا سبب بن سکتے ہیں۔اس کے لیے اسلام نے بعض ایسی چیزوں کو بھی گوارہ کیا ہے جو اسلام کی اصل سے میل نہیں کھاتیں،مثلاً پردہ کی اسلام میں کس قدر اہمیت ہے،وہ سب پر واضح ہے،لیکن منگیتر کو دیکھنے کی نہ صرف یہ کہ اجازت دی گئی ہے بلکہ اسے بہتر قرار دیا گیا ہے، یہاں تک کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ شہوت اور بدنگاہی کا اندیشہ ہو تو بھی مرد ایسی لڑکی کو دیکھ سکتا ہے جس سے نکاح کا ارادہ ہو (عالمگیری ۵/۲۷۷،کتاب الکراہیۃ) اسی طرح باوجود اس کے کہ اسلام انسانی مساوات اور برابری کا قائل ہے اور ان کے نزدیک عظمت اور برتری اور کمتری صرف تقویٰ اور اللہ کا خوف ہے، لیکن چوں کہ بسا اوقات خاندانی اور معاشی یا پیشہ ورانہ برتری اور کمتری میاں بیوی کے درمیان کھچاؤ اور نفرت کی بنیاد بن جاتا ہے، اس لئے شریعت نے اس کی بھی اجازت دی کہ نکاح کرتے وقت اس کا لحاظ رکھا جائے۔

طلاق چوں کہ اسی رشتہ کو توڑنے کا نام ہے، اس لئے فطری بات ہے کہ اسلام اس کو پسند نہیں کرتا، حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کو سب سے زیادہ خوشی اس سے ہوتی ہے کہ میاں بیوی کے درمیان جدائی پیدا کر دی جائے۔(صحیح مسلم) حضرت ثوبان ﷛ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جو عورت بلا وجہ شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے، اس پر جنت حرام ہے۔(ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ) آپ ﷺ نے نکاح کا حکم فرمایا اور طلاق سے منع فرمایا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اس طرح مزہ چکھنے اور ایک عورت یا مرد کی لذت اٹھا کر پھر اس سے جدائی اختیار کرنے والے مردوں اور عورتوں کو پسند نہیں کرتا۔(ان الله لا يحب الذواقين و الذواقات)

مگر کبھی کبھی طلاق اور میاں بیوی کی جدائی ایک ضرورت اور مجبوری بن جاتی ہے، کسی وجہ سے زندگی کی راہ پر ان دونوں کا ایک ساتھ چلنا ممکن نہیں ہوتا اور کچھ ایسے حالات ہو جاتے ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا اور علاحدہ رہ کر زندگی بسر کرنے ہی میں دونوں کے لئے سکون وچین اور اطمینان رہتا ہے۔ان حالات میں شریعت ایک ناپسندیدہ ضرورت سمجھ کر اس کی اجازت دے دیتی ہے، اسی لئے حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جن

چیزوں کی اجازت دی ہے، ان میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور قابل نفرت چیز طلاق ہے،ابغض الحلال عند اللہ الطلاق (ابوداؤد،ابن ماجہ) اور فقہاء نے بھی اسے بلاضرورت ناجائز اور ممنوع قرار دیا ہے۔ (ردالمحتار ۱۷۷/۳)

چند صدی قبل تک اسلام پر اعتراض کیا جاتا تھا کہ اس نے جدائی کی اجازت دے کر ظلم کیا ہے، دنیا کے دو بڑے مذاہب ہندومت اور عیسائیت میں اس کی مطلق اجازت نہ تھی (عیسائیوں کے یہاں اس قانون کی بنیاد حضرت مسیح کا یہ ارشاد تھا: جسے خدا نے جوڑا اسے آدمی جدا نہ کرے) (متی ۱۹:۶) حالاں کہ اس حکم کی حیثیت یکسر اخلاقی تھی، جیسا کہ اس سے قریب تر حکم قرآن مجید نے بھی دیا ہے۔ (البقرۃ:۳)

مگر یہ ایک نا قابل عمل اور غیر فطری بات تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ اس قانون میں تبدیلی پیدا کرنی پڑی اور آج ہندوستان میں ہندو قانون اور تمام عیسائی ممالک کے عیسائی قانون میں طلاق کی گنجائش پیدا کر لی گئی ہے۔

سب سے پہلے وعظ ونصیحت اور سمجھاؤ سے کام لیا جائے، اگر یہ کافی نہ ہو تو اپنی ناراضگی کے سنجیدہ اظہار کے لیے اپنی خواب گاہ اور بستر علیحدہ کرلو، یعنی وقتی طور پر اس سے مباشرت کرنا چھوڑ دو، پھر اگر یہ گریز بھی عورت کی اصلاح نہ کر سکے تو مناسب حدوں میں اس کی کمزوری اور نزاکت کو سامنے رکھتے ہوئے تھوڑی مار پیٹ بھی کر سکتے ہو، اب اگر اس کی اصلاح ہو جائے تو بہتر رفیق زندگی کی طرح اس کے ساتھ رہو۔ ان تمام صورتوں کو اختیار کرنے کے باوجود اصلاح نہ ہو سکے اور عورت بیجا نافرمانی اور زیادتی پر آمادہ ہو تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ آپس میں اس بگاڑ کو دور کرنے سے قاصر ہیں، لہٰذا ان حالات میں قرآن کا حکم ہے۔

''اگر ان دونوں میں شدید اختلاف کا اندیشہ ہو تو مرد اور عورت دونوں کی طرف سے ایک پنچ (حکم) کو بھیجو، اگر یہ دونوں واقعی اصلاح چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ ضرور ان دونوں کے درمیان موافقت پیدا کردے گا۔ بے شک اللہ علیم وخبیر ہے۔ (النساء:۵۳)

یعنی دوسرے سمجھ دار، دین دار اور ہمدرد افراد کے ذریعہ مصالحت کی کوشش کی

جائے گی، اگر اس طرح آپسی خلش دور ہو جائے تو دونوں میاں بیوی کی طرح زندگی بسر کریں گے، لیکن اگر ثالثی اور پنچوں کی کوشش کے باوجود دونوں میں موافقت نہ ہو سکے، ایک دوسرے سے متنفر ہوں اور عورت کی طرف سے نامناسب حد تک مسلسل عدول حکمی اور نافرمانی ہو رہی ہو، تو اب شریعت طلاق کی اجازت دیتا ہے۔ پھر اب بھی ایک ہی دفعہ تین طلاقیں نہ دے، بلکہ سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ پاکی کی حالت میں (جس میں بیوی سے مباشرت نہ کی ہو) لفظ ''طلاق'' کے ذریعہ صرف ایک طلاق دی جائے، اس طلاق کے بعد اس کو یہ حق رہے گا کہ عدت گذرنے سے پہلے پہلے تک اگر اپنے فیصلہ پر پشیمانی یا عورت کی طرف سے ندامت کا اظہار اور بہتر زندگی کا وعدہ ہو تو بیوی کو لوٹا لے اور اگر وہ علیحدگی کے فیصلہ پر اٹل ہو تو یوں ہی چھوڑ دے، عدت گذرنے کے بعد خود بخود یہ رشتہ ختم ہو جائے گا۔

عورتیں بھی طلاق کے واقعات کم کرنے میں بڑا اہم اور مؤثر کردار ادا کر سکتی ہیں۔ ان کو چاہئے کہ مختلف طریقوں سے شوہر کو اپنی طرف راغب اور مائل رکھیں اور کوئی ایسی بات پیش نہ آنے دیں جو باہمی نفرت اور آپسی اختلاف کا باعث بن سکتی ہے۔ اس کے لئے سب سے اہم بات یہ ہے کہ پوری طرح شوہر کی مزاج شناس ہوں، وہ زندگی کے ہر گوشہ میں اس بات کا اندازہ لگاتی رہیں کہ وہ کس بات اور کس عمل سے خوش ہوتا ہے اور کن باتوں سے ناخوش؟

پھر اگر کبھی ناراض ہو جائے تو اس کی کیا مرغوب چیز ہے، جس کا سہارا لے کر اس کو خوش کیا جا سکتا ہے؟ کس بات اور کس ضرورت کے اظہار کے لئے کیا مناسب وقت ہے؟ جن خواتین نے اس رمز کو جان لیا اور اپنی ازدواجی زندگی میں اس کا خیال رکھا ان کی زندگی ہمیشہ خوش رہے گی اور ان شاء اللہ طلاق کی نوبت نہ آئے گی۔

یہ تو ایک اصولی بات ہے، اس کے علاوہ چند عمومی باتوں کا خاص لحاظ رکھنا چاہئے۔

اول یہ کہ مرد جب تھک کر اپنے کام سے واپس آئے، اس وقت پوری خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کرے اور فوراً اپنی کوئی ایسی ضرورت نہ پیش کر دے جو مرد کے لیے

پریشانی کا باعث ہو۔حدیث میں نیک بیوی کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ شوہر اس کی طرف دیکھے تو وہ شوہر کو خوش کر دے،عورت اس حدیث کا مصداق اسی وقت ہو سکتی ہے جب اس پر عمل کرے۔

دوسرے یہ کہ مرد کے لئے اپنے آپ کو سجا سنوار کر رکھے اور پوری طرح زیبائش و آرائش کرے،شریعت دوسروں کے لئے زیبائش و آرائش کی اجازت نہیں دیتی،جب کہ شوہر کے لئے اس کو پسند کرتی ہے،اس کی وجہ سے شوہر عفیف و پاک دامن رہتا ہے، بدنگاہی سے بچتا ہے اور دوسری عورتوں کی طرف اس کی توجہ نہیں ہوتی۔

تیسرے اس بات کا خیال رکھے کہ ایسے مردوں سے انتہائی بے توجہی برتے جو شوہر کو ناپسند ہوں،غیر محرم سے یوں بھی شریعت پردہ کا حکم دیتی ہے،لیکن خصوصاً ان لوگوں سے جائز حدوں میں بھی ربط نہیں رکھنا چاہئے جو شوہروں کو ناپسند ہوں،اس معاملہ میں مرد کی طبیعت فطری طور پر بہت حساس واقع ہوئی ہے۔

چوتھے شوہر سے اپنی ضروریات کے مطالبہ میں ایسا رویہ اختیار نہ کرے جس سے خود غرضی کا اظہار ہوتا ہو،یا ایسا محسوس ہوتا ہو گویا وہ شوہر کی حریف ہے،مثلاً شوہر کے پاس کپڑے ہوں یا نہ ہوں اپنے لئے کپڑوں کا مطالبہ یا اگر شوہر کپڑا لائے تو اس کا مقابلہ، بلکہ زیادہ سے زیادہ قناعت اور کفایت شعاری کی راہ اختیار کرے اور اپنے مقابلہ میں شوہر اور دوسرے اہل خانہ کی ضرورت کو مقدم رکھے۔اسی طرح جب وہ شوہر کے دل میں اپنا گھر بنالے تو خود بخود مرد اس سے زیادہ کرے گا جو وہ چاہتی ہے۔

ان کے علاوہ کھانے اور پکوان میں ایسا تنوع کہ مرد کا رجحان ہوٹلوں کی طرف نہ رہے،نیز اس بات کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے کہ دوسروں کے پاس شوہر کی شکایت نہ کرے،بلکہ اگر باہمی رنجش اور کبیدگی پیدا ہوگئی تو اپنے ہی حد تک اس کو محدود رکھے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے سماج میں ازدواجی زندگی سے متعلق اسلامی تعلیمات کو عام کریں اور یہ بتائیں کہ طلاق کب اور کس طرح دینی چاہئے۔

(۱۴ر مئی ۱۹۹۹ء)

نفقۂ مطلقہ کا مسئلہ

ایک دہائی سے زیادہ عرصہ سے نقطۂ مطلقہ کا مسئلہ بحث ونظر کا موضوع بنا ہوا ہے، شاہ بانو کیس نے پورے ملک میں جو ہلچل پیدا کی تھی، اور اس مسئلہ کے پس منظر میں تحفظ شریعت کی تحریک نے جس طرح پورے ملک کے مسلمانوں کو بیدار کیا تھا، اور احکام شریعت کو سمجھنے اور اس کی معاشرتی اہمیت کا مطالعہ کرنے کا جو شعور پیدا کیا تھا، وہ یقیناً مسلمانان ہند کی دینی اور ملی تاریخ کا ایک روشن باب ہے، اسی کے نتیجہ میں ''تحفظ حقوق مسلم خواتین بل'' پاس ہوا، مسلمان توقع رکھتے تھے کہ یہ قانون اس مسئلہ میں مسلمانوں کی بے چینی اور اضطراب کا مداوا کرے گا، لیکن افسوس کہ اس سیدھے سادھے قانون کی ہماری بعض عدالتوں نے ایسی تشریح کی، جس نے اس قانون کے بنیادی مقصد ہی کو مجروح کر کے رکھ دیا، اور ایسی تشریحات کی گئیں جو ''قانون کی تشریح'' سے آگے بڑھ کر ''قانون وضع کرنے'' کے دائرہ میں آتی ہیں، ملک کے مختلف ہائی کورٹوں نے اس قانون کی الگ الگ تشریحات کی ہیں، بعض عدالتوں نے عدت کے بعد مطلقہ کو نفقہ کا مستحق نہیں قرار دیا، اور بعض عدالتیں مطلقہ کو عدت گذرنے کے بعد بھی نفقہ کا حق دار قرار دیتی ہیں، ابھی ۱۲؍ جولائی ۲۰۰۰ء کو ممبئی ہائی کورٹ نے بھی ایک مقدمہ میں یہی نقطۂ نظر اختیار کیا ہے، اس طرح کے فیصلوں نے یقیناً مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہونچائی ہے،

بعض بھولے بھالے اور قانون کی روح اور مضمرات سے ناواقف غیر مسلم بھائی تو کیا، مسلمان بھی مطلقہ کے لئے نفقہ کے حق کو ایک جائز اور انسانی حق باور کرتے ہیں، حالاں کہ نہ صرف اسلامی بلکہ عقلی نقطۂ نظر سے بھی یہ بات ناقابل فہم ہے، —— جہاں تک قانون شریعت کی بات ہے تو شریعت میں ایک شخص کا نفقہ دوسرے شخص پر تین وجوہ میں

سے کسی ایک وجہ سے واجب ہوتا ہے، قرابت، حبس، ملکیت، ماں باپ، بال بچے، بھائی بہن، دادا دادی، اور بعض حالات میں دوسرے اعزہ اور رشتہ داروں کا نفقہ قرابت کی وجہ سے واجب ہوتا ہے، قرابت کی بناء پر نفقہ واجب قرار دئے جانے کے سلسلہ میں دو اصول بنیادی اہمیت رکھتے ہیں، ایک یہ کہ قرابت کی بناء پر اس شخص کا نفقہ واجب ہوگا جو خود اپنی کفالت سے قاصر ہو، دوسرے اس شخص پر واجب ہوگا جو اتنا خوش حال ہو کہ اپنی ضروریات پوری کر کے اس شخص کی کفالت بھی کر سکتا ہو۔

ملکیت کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی چیز کا مالک ہو، اس کا نفقہ اس پر واجب ہوگا، جب غلام اور باندی کا وجود تھا تو اسی بنیاد پر مالک پر غلام اور باندی کا نفقہ واجب قرار دیا جاتا تھا، اسی طرح اسلام جانوروں کا نفقہ ان کے مالک پر واجب قرار دیتا ہے، اگر کوئی شخص اپنے جانوروں کا چارہ فراہم نہ کر سکے تو اس کے لئے یہ حکم ہے کہ اگر حلال جانور ہو تو یا تو ذبح کر کے کھالے یا فروخت کر دے اور حرام جانور ہو تو اسے بہر حال فروخت کر دے، اس کو بھوکا رکھ کر یوں ہی اپنی ملکیت میں رکھنا جائز نہیں، اور دیانت و اخلاق کے خلاف ہے۔

''حبس'' کے معنی ہیں روکے رکھنا، یعنی اگر ایک شخص دوسرے شخص کی وجہ سے محبوس ہو، پابندی کی حالت میں ہو اور معاشی سرگرمیاں اختیار نہیں کر سکتا ہو تو اس کا نفقہ اس شخص پر واجب ہوگا جس کی وجہ سے وہ پابندی اور حبس کی حالت میں ہے، ملازمین اور مزدوروں کی تنخواہ، گورنمنٹ اور آجرین پر کیوں واجب ہے؟ اسی لئے کہ وہ سرکار اور آجر کے لئے محبوس ہے — بیوی کا نفقہ شوہر پر اسی جہت سے واجب ہوتا ہے، بیوی گھر کی دیکھ بھال، بال بچوں کی پرورش اور امور خانہ داری کے لئے گویا محبوس ہوتی ہے، اس لئے شوہر کے ذمہ اس کا نفقہ واجب رکھا گیا ہے، حبس کی وجہ سے جو نفقہ واجب ہوتا ہے، اس کے سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ محبوس و پابند شخص غریب و تنگ دست ہو یا معاشی اعتبار سے خوش حال و خود مکتفی، اور اسی طرح وہ جس شخص کے لئے محبوس ہے، اس کی معاشی حالت اچھی ہو یا معمولی، بہر صورت نفقہ واجب ہوگا۔

جب ایک عورت اپنے شوہر سے مطلقہ ہو جاتی ہے، تو عدت گذرنے کے بعد وہ

اپنے شوہر کے لئے محبوس نہیں، دوسرا نکاح کر سکتی ہے، اور شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے معاشی سرگرمی بھی اختیار کر سکتی ہے، اس لئے ''حبس'' کی وجہ سے نفقہ واجب ہونے کی کوئی وجہ نہیں، اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ طلاق واقع ہونے کے بعد اپنے سابق شوہر سے اس کی کوئی قرابت باقی نہیں رہی، کیوں کہ ازدواجی رشتہ خونی اور اٹوٹ رشتہ نہیں، بلکہ ایک ایسا رشتہ ہے جو زبان کے بول سے وجود میں آتا ہے اور زبان کے بول ہی سے ختم بھی ہو جاتا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ طلاق کے بعد میاں بیوی میں کوئی قرابت باقی نہیں رہتی — جہاں تک ملکیت کی بات ہے تو اسلام کی نگاہ میں شوہر و بیوی نکاح کے دو فریق اور زندگی میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں نہ کہ مالک اور مملوک، عورت کو بعض قوانین میں مرد کی ملکیت اور جائیداد تصور کیا جاتا تھا، اسلام نے اس تصور کو مٹایا، اور کہا کہ جیسے مردوں کے عورتوں پر حقوق ہیں، اسی طرح عورتوں کے مردوں پر، **ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف**، (البقرۃ: ۲۲۸) اس طرح اسلامی قانون کے نقطۂ نظر سے طلاق اور عدت گذرنے کے بعد کوئی ایسی بنیاد باقی نہیں رہتی جس کی وجہ سے مرد پر اس عورت کا نفقہ واجب قرار دیا جائے۔

اصل یہ ہے کہ ہندو مذہب میں حقیقی تصور یہی ہے کہ بیوی شوہر کی ملکیت ہوتی ہے، اور ایک عورت کو ہمیشہ اسی شوہر کے ساتھ بندھا رہنا ہے، وہ اپنے آپ کو اس کی قید نکاح سے آزاد نہیں کر سکتی، دراصل اسی تصور نے ''ستی'' کے رواج کو جنم دیا، کہ جب شوہر مر جائے تو عورت بھی اس کے ساتھ نذر آتش کر دی جائے، پس، چونکہ ہندو سماج میں عورت کے مطلقہ ہونے کا تصور نہیں، اس لئے مطلقہ سے متعلق احکام کا بھی وجود نہیں، اسی لئے برادرانِ وطن کے لئے یہ بات حیرت انگیز ہو سکتی ہے کہ کوئی عورت جب ایک بار نکاح میں آچکی ہو تو پھر وہ نکاح کی وجہ سے واجب ہونے والے نفقہ سے کیوں کر محروم ہو سکتی ہے؟ لیکن اسلام میں نکاح کا جو اعلیٰ تصور ہے اور اس نے عورت کو جو مقام عطا کیا ہے، اس کے پس منظر میں جب دیکھا جائے تو یہ بالکل معقول بات ہے کہ جب مرد و عورت کے درمیان ازدواجی رشتہ ہی باقی نہیں رہا تو اس کا نفقہ کیوں کر واجب ہوگا؟

خالص عقلی اور سماجی مصالح کے نقطۂ نظر سے بھی مرد پر مطلقہ کا نفقہ واجب قرار دینا نامناسب بات ہے، اگر مرد کو یہ معلوم ہو جائے کہ اپنی بیوی کو طلاق دینے کی صورت میں اسے زندگی بھر نفقہ دیتے رہنا پڑے گا تو جو مرد اپنی بیوی سے نجات چاہتا ہو اس میں نفرت کے جذبات مزید بڑھیں گے، اس زندگی بھر کی سزا سے نجات پانے کے لئے وہ غیر قانونی راستے اختیار کرے گا، اور بجائے طلاق دینے کے بیوی کی زندگی کے درپے ہوگا، اور اس طرح کے واقعات پیش آئیں گے۔ جو روز ہمارے اخبارات کی سرخیاں بنتے ہیں، قانونی راستے کو اتنا مشکل، دشوار اور تکلیف دہ نہ بنانا چاہئے کہ لوگ غیر قانونی راستے اختیار کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

دوسرے بدقماش اور بیمار ذہن عورتیں کوشش کریں گی کہ شوہر کو اس طرح دق کریں کہ وہ طلاق دینے پر مجبور ہو جائے اور پھر اپنی مفسدانہ حرکتوں میں مشغول رہیں گی، ایسے واقعات بھی سامنے آئے ہیں کہ ایک مطلقہ عورت اپنے آشنا کے ساتھ علانیہ عدالت میں آتی ہیں اور سابق شوہر سے نفقہ وصول کر کے لے جاتی ہے، گویا مرد جرم بے گناہی کی سزا پا رہا ہے، اور عورت اپنی عیش کوشی کے لئے ''وظیفہ، حسن خدمت'' حاصل کر رہی ہے، کیا اسے سماجی انصاف کہا جا سکتا ہے؟ بلکہ ایسا بھی ممکن ہے کہ بعض بدقماش عورتیں سابق شوہر سے نفقہ حاصل کرنے اور آتش انتقام ٹھنڈی کرنے کی غرض سے دوسرے نکاح سے احتراز کریں، اور بے راہ روی کو ترجیح دیں——

آخر ایک شخص کا نفقہ دوسرے پر واجب قرار دینے کے لئے کوئی بنیاد و اساس تو ہونی چاہئے، اگر اجیر اور آجر کے درمیان اجارہ ختم ہونے کے بعد ایک پر دوسرے کی واجبات عائد نہیں ہوتے، ملازمت ختم ہونے کے بعد ملازم تنخواہ کا مستحق نہیں ہوتا، تو یہ کون سی منطق ہے کہ ایک مرد و عورت کے درمیان نکاح کا رشتہ باقی نہیں رہا، لیکن مرد نفقہ ادا کرتا رہے؟—— اور پھر کیا کوئی غیرت مند شریف عورت اس بات کو گوارا کر سکتی ہے کہ ایک اجنبی اور بے تعلق شخص کے لقموں پر اس کی پرورش ہو، اور ایک ایسے شخص کے سہارے وہ زندگی گذارے جس نے اسے رد کر دیا ہے، اس لئے حقیقت یہ ہے کہ عقل اور سماجی

مصلحت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ مطلقہ کا اس کے سابق شوہر پر نفقہ واجب نہیں ہونا چاہئے۔

لیکن کیا اسلام نے ایسی عورتوں کو بے سہارا کر دیا ہے؟ ہرگز نہیں! ـــــ اسلامی نقطۂ نظر سے نکاح کی وجہ سے عورت کا رشتہ اپنے خاندان سے منقطع نہیں ہوتا، اسی لئے وہ اپنے ماں باپ اور بعض اوقات بھائی اور چچا وغیرہ سے میراث کی حق دار ہوتی ہے، جب کوئی عورت مطلقہ ہو جائے تو اب اس کے والدین اور قریبی محرم رشتہ داروں پر حسب مراتب اس کا نفقہ واجب ہوتا ہے، اس سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ اگر اس خاتون کا انتقال ہو جائے تو جو لوگ شرعاً اس کے وارث ہوں گے، ان ہی اعزہ پر اس کا نفقہ واجب ہوگا، طلاق کے وقت مہر کی صورت میں اسے ایک خطیر رقم ملتی ہے، جسے وہ کاروبار میں شریک کر کے کچھ گذران حاصل کر سکتی ہے، اور اگر اس کی گود میں طلاق دینے والے شوہر کے بچے اور بچیاں ہیں تو بچوں کی عمر آٹھ سال ہونے تک اور لڑکیوں کی عمر بالغ ہونے تک ماں پرورش کی حق دار ہے، اس عرصہ میں وہ سابق شوہر سے اس کے بچوں کی پرورش کرنے کی اجرت وصول کر سکتی ہے، یہ نفقہ نہیں ہے، بلکہ اس کی محنت کا معاوضہ ہے ـــــ اس لئے ایسا نہیں ہے کہ اسلام نے ایسی عورت کو محروم اور بے آسرا رکھا ہو، اور سب سے بڑا آسرا یہ ہے کہ اسلام نے نہ صرف دوسرے نکاح کی اجازت دی، بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی ہے،

لیکن قانون کے فوائد اور نقصانات کا تعلق بہت کچھ قانون پر عمل کرنے والوں کے صحیح اور غلط استعمال سے بھی ہے، مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ مطلقہ عورتوں کے نکاح کو رواج دیں، ہندو معاشرہ کی طرح ایسی خواتین کو منحوس نہ سمجھیں، سارے مسئلہ کی اصل جڑ یہی ہے، عرب معاشرہ میں آج بھی مطلقہ کا کوئی مسئلہ نہیں، اور طلاق کے واقعہ کو چنداں دشوار نہیں سمجھا جاتا، کیوں کہ وہاں طلاق شدہ عورتوں کا نکاح کوئی دشوار بات نہیں، بلکہ عدت گذرتے گذرتے پیام آنے شروع ہو جاتے ہیں، اسی لئے دونوں خاندانوں میں اس طرح کی تلخی بھی پیدا نہیں ہوتی، جو ہندوستان میں دیکھنے میں آتی ہے ـــــ دوسرے ہماری محبت اور حسن سلوک کا دائرہ اتنا سمٹ گیا ہے کہ ہم ''اپنے اور اپنے بچوں'' کے سوا کسی کی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے، یہاں تک کہ بعض لوگ تو بوڑھے ماں باپ کو بھی بوجھ سمجھنے

لگے ہیں، ان حالات میں مطلقہ عورتوں کے تئیں ذمہ داریوں کے احساس کی کیا خاک توقع رکھی جاسکتی ہے؟ اس لئے یہ بات بہت ضروری ہے کہ مسلم سماج میں اس احساس کو جگایا جائے اور لوگوں کے ضمیر کو جھنجھوڑا جائے کہ ایسی بے کس و بے آسرا عورتوں کی ضروریات کی کفالت بھی ہماری ذمہ داری ہے، اور یہ احسان نہیں، بلکہ ایک حق کی ادائیگی ہے!

اگر ہم خود اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں اور اپنے فرائض کو ادا کرنے میں چوکس رہیں تو قانون شریعت پر نہ کوئی زبان کھل سکتی ہے، اور نہ کوئی انگلی اٹھ سکتی ہے!!

(تاریخ...... ......)

پردہ — حفاظت نہ کہ قید

حیرت کے کانوں سے سنئے اور یقین نہ آئے پھر بھی یقین کیجئے، کہ دنیا کے جغرافیہ میں مسلم ملک کے نام سے پایا جانے والے ایک ملک ''جمہوریہ ترکی'' نے ایک اسلام پسند خاتون رکن اسمبلی کو اسمبلی کی رکنیت بلکہ ملک کی شہریت سے بھی محروم کردیا ہے، شاید آپ سمجھیں کہ اس خاتون نے کوئی اخلاقی جرم کیا ہوگا، کسی سماجی بُرائی کی مرتکب ہوئی ہوگی، بے حیائی اور بے شرمی کی کوئی بات اس سے صادر ہوئی ہوگی، دین و مذہب اور اخلاقی اقدار کا مذاق اڑایا ہوگا؟ مگر نہیں، ایسا نہیں ہے! اس ''گنہ گار خاتون'' نے ترکی کے سیکولرزم پر حملہ کیا ہے، اس کی سیکولر قدروں پر کلہاڑی چلائی ہے اور ایک ایسا کام کیا ہے جس نے ترکی کے ''روشن خیال'' اور ترقی پسند حکمرانوں کو شرم سے پانی پانی کردیا ہے، اور ان کی جبینِ غیرت گڑ کر رہ گئی ہے — اس خاتون رکن اسمبلی کا ''جرم'' یہ تھا کہ وہ اسکارف پہن کر اسمبلی میں آتی تھی، اور اس کی نسوانی غیرت و حیا کو اس پر اصرار تھا، یہ اتنی بڑی غلطی تھی جو ترک حکومت کے لئے نہایت ناقابلِ برداشت اور شرم ناک بات تھی۔

حالانکہ ترکی کا زیادہ تر حصہ ایشین علاقہ ہے، ایک چھوٹی سی ٹکڑی یورپ میں ہے، اس کے مغربی پڑوسیوں کا رویہ کبھی بھی اس کے ساتھ دوستانہ تو کیا منصفانہ بھی نہیں رہا، ترکی کی طرف سے یونان کی کدورت اور اس کو زک پہونچانے کی کوشش کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں، بوسنیا، کوسووو اور بلقان کے علاقوں میں مغربی جارحیت اور انسانیت کشی کے جو واقعات پیش آتے ہیں، اس کی تہہ میں ترکوں سے تاریخی عداوت ہی کارفرما ہے، اس کے مغربی دوستوں کا حال یہ ہے کہ باوجود صد ہزار خوشامد کے آج تک اسے یورپین یونین میں داخلہ نہیں مل سکا۔ اور یورپ کی تجارتی منڈی میں اس کے ساتھ امتیازی سلوک برتا

جاتا ہے، یہ مغربی ممالک ہی ہیں جو کُردوں کو ترکوں کے خلاف اور ترکوں کو کردوں کے خلاف اُکساتے رہتے ہیں، تاکہ سیاسی عدم استحکام برقرار رہے، دوسری طرف ترکی کی سربلندی اور فتحمندی کی تاریخ دیکھئے، یہ عالم اسلام ہی ہے جس نے ترکی کو صدیوں خلافت کا تاج گہربار پہنایا، اور اس طرح ایشیا، افریقہ اور یورپ کے ایک بہت بڑے حصہ پر بلا شرکت غیرے ترکوں نے حکومت کی، یہ ترک جن کا دنیا کی قیادت میں کوئی کردار نہیں تھا، اور تہذیب وثقافت کا کبھی اس قوم سے گذر نہیں ہوا تھا، اسلام کی بادِ نسیم نے اس کو ایک بہار آفریں انقلاب سے ہمکنار کیا، اور ترک قائدانہ صلاحیت، عسکری قوت، علمی وفکری بلندی اور تمدن وثقافت کا ایک ایسا آفتاب بن کر مشرق ومغرب پر چھا گئے کہ کسی کور چشم کے لئے بھی اس سے انکار ممکن نہ تھا، لیکن اسلام کا منت کش ہونے کی بجائے اسلامی قدروں ہی سے بغاوت کو ترکوں کی بدبختی اور احسان فراموشی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے؟ جس ملک نے صدیوں حرمین شریفین اور مسلمانوں کے قبلۂ اوّل کی حفاظت کا شرف حاصل کیا ہو، وہ آج اسرائیل کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کرے اور فوجی مشقیں کرے، اس سے بڑھ کر عجوبہ اور کیا ہوگا؟

یہ سیکولرزم کا لفظ بھی ''موم کی ناک'' سے کم نہیں، جہاں چاہیں سیدھی کردیں، جہاں چاہیں ٹیڑھی کردیں، جب چاہیں پھیلادیں اور جب چاہیں سمیٹ دیں، دنیا میں شاید ہی کسی لفظ سے اتنی متضاد حقیقتوں کو وابستہ کیا جاتا ہو، اور جتنا ظلم اس لفظ کے ساتھ کیا جاتا ہے شاید کسی اور لفظ کے ساتھ کیا جاتا ہو، امریکہ کا سیکولرزم یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنے مذہب اور تہذیب پر چلنے کی آزادی ہے، خواہ وہ کس قدر بھی خلافِ عقل اور خلافِ فطرت ہو، مرد برقع پہننے لگے، اور عورتیں بے لباس ہوجائیں، تب بھی کوئی اعتراض نہیں، برطانیہ کا سیکولرزم یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنے مذہب پر چلنے کی آزادی ہے؛ لیکن اگر کوئی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اہانت کرے تو قانونی جرم، اور دوسرے مذہبی پیشواؤں کے ساتھ بے احترامی کی جائے تو کوئی مواخذہ نہیں، خود ہمارے ملک میں ہر سیاسی جماعت کے پاس سیکولرزم کا اپنا تصور ہے، یہاں تک کہ مسجدوں کو شہید اور عیسائی مبلغین کو زندہ نذرِ آتش کرنے والے بھی

اپنے آپ کو سیکولر کہتے ہیں، گویا سیکولرزم ایسی سخت جان مخلوق ہے کہ اس پر کتنا بھی وار کرو، اسے کوئی نقصان نہیں پہونچتا، ترکوں کا سیکولرزم شاید سب سے زیادہ ''روشن خیالی'' پر مبنی ہے، کہ فرانس جس کو جمہوری انقلاب کا مؤسس سمجھا جاتا ہے، اور جو دنیا کی بڑی طاقتوں میں ایک ہے، اس کے سیلوکرزم میں تو پردہ اور نقاب سے کوئی رخنہ نہیں پڑتا، لیکن ترکوں کا سیکولرزم اس سے مرگ بہ لب ہو جاتا ہے، سیکولرزم تو اصل میں رائے عامہ کے احترام اور ایک دوسرے کی شخصی آزادی میں عدم مداخلت سے عبارت ہے؛ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اگر کسی ملک میں بے دین اور بدتہذیب لوگ رائے عامہ کے ذریعہ برسر اقتدار آجائیں، تو سیکولرزم کا تقاضہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کے اقتدار کو قبول کیا جائے؛ لیکن اگر ترکی اور الجزائر میں رائے عامہ اسلام پسند حلقوں کے حق میں ہے تو رائے عامہ کو پس پشت ڈال دینا اور فوجی دہشت گردی کو ان پر مسلط کر دینا سیکولرزم ہے، گویا کہ رائے عامہ کی پاس داری بھی سیکولرزم اور رائے عامہ کا قتل بھی سیکولرزم ۔ سیکولرزم کا یہ وہ معیار ہے جو آتا ترک مصطفیٰ کمال پاشا نے قائم کیا ہے، یہ تلخ حقیقت ہے کہ اس شخص نے اسلام کو جو نقصان پہونچایا ہے، اسلامی تاریخ میں شاید ہی کسی منافق نے بھی اسلام کے ساتھ ایسی جفا کیشی روا رکھی ہو۔ فعلیہ ماعلیہ۔

بہر حال مجھے یہ خبر سن کر بے ساختہ اکبر الہ آبادی کا وہ شعر یاد آیا کہ

ایک روز چند بیبیاں آئیں جو بے پردہ
اکبر زمین میں غیرت قوی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ کیا ہوا ؟
کہنے لگیں کہ عقل پر مردوں کے پڑ گیا !

اکبر نے جو بات کہی ہے وہ ایک حقیت ہے، کہ پردہ کی مخالفت کو کور عقلی کے سوا اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا، یہ ایک واقعہ ہے کہ انسان کے لئے اس دنیا میں دولت اور عورت کو سب سے زیادہ پرکشش بنایا گیا ہے، سالانہ جرائم کے اعداد و شمار ملاحظہ کیجئے اور ان کے محرکات کا جائزہ لیجئے تو پچانوے فیصد جرائم کے پیچھے یہی حصول زر اور حصول زن کا جذبہ

کارفرما ہے اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ عورتیں، مقابلہ مال و دولت کے زیادہ اس کا باعث بنتی ہیں، بلکہ اکثر اوقات زر کو زن پر نثار کیا جاتا ہے، اب غور کیجئے کہ مال و اسباب کو چھپانے اور نظر بد سے بچانے کیا کچھ جتن نہیں کئے جاتے، بینکوں کی عالیشان اور قلعہ نما عمارتیں اسی لئے تو ہیں؟ رقم کی معمولی مقدار کے لئے بھی کیا آہنی جوڑیاں نہیں رکھی جاتیں، اور مضبوط تالے نہیں لگائے جاتے؟ ایک شہر سے دوسرے شہر جانا ہو تو رقم رکھنے کے بجائے چیک اور ڈرافٹ لے جائے جاتے ہیں، کس قدر ان کی حفاظت اور صیانت کا انتظام کیا جاتا ہے، کہ کوئی ہاتھ وہاں تک پہونچنے نہ پائے کوئی نگاہ دیکھنے نہ پائے، یہاں تک کوشش کی جاتی ہے کہ کسی مسافر کے خیال میں بھی یہ بات نہ آئے کہ آپ کے پاس اتنی رقم موجود ہے؟

تو عورت کے وجود اور اس کی عزت و آبرو کے مقابلہ بے قیمت مال و اسباب کے تحفظ کی اتنی کوششیں اور ان کو نگاہِ حرص سے بچا کر رکھنے کا اتنا خیال! لیکن عورتیں جو عزت و ناموس کا آبگینہ ہیں، اور جن کے آئینہ عفت پر ایک بال بھی انسان کی فطرتِ سلیمہ کو گوارا نہیں، ان کو بے پردہ رکھنا کہ سر اور بازو کھلے ہوں، ٹانگیں نظر آتی ہوں، سینہ و پشت سے لوگوں کی نگاہیں ٹکراتی ہوں، کیا شرافت کی بات ہے؟ اور شرافت کو تو جانے دیں، کہ مغربی تہذیب نے اپنی لغت سے اس لفظ کو کھرچ کر رکھ دیا ہے، کیا عقل اور انسانی فطرت بھی اس کو قبول کرتی ہے؟

نظر ہی فتنوں کا حرف آغاز ہے، کہ پہلے نگاہ پڑتی ہے پھر آنکھوں سے آنکھیں لڑتی ہیں، اس کے بعد زباں ہوس اپنا مدعیٰ بیان کرتی ہے۔ پھر یکے بعد دیگرے بداخلاقی کے دلدل میں انسان پھنستا چلا جاتا ہے، اور اس کا زیادہ نقصان عورتوں کو اٹھانا پڑتا ہے، اسے سماج میں ذلیل و رسوا ہونا پڑتا ہے، اسے بے باپ کی اولاد کی ماں بننا پڑتا ہے، پھر وہ گناہوں کے جال میں اس طرح پھنستی چلی جاتی ہیں کہ چاہتے ہوئے بھی اس دلدل سے باہر آنا اس کے لئے ممکن نہیں ہوتا اور وہ ہر نگاہ ہوس کی آسودگی کا سامان بنتی رہتی ہے، پس، پردہ عورتوں کے لئے نہ قید ہے اور نہ ان کی تذلیل، بلکہ یہ ان کی حفاظت و صیانت کا ایک نظام ہے۔

مذہب اور شریعت کے علاوہ خود قانونِ فطرت بھی ہمیں اس جانب متوجہ کرتا ہے کہ جو چیزیں عام، غیر اہم اور کشش سے خالی ہوں ان کے لئے حفاظت وصیانت کا اہتمام درکار نہیں، اور جو چیزیں قیمتی، اہم اور وجہ کشش ہوں، ان کی حفاظت کے لئے قدرتی تدبیریں موجود ہیں، پتھر کی چٹانیں کھلی اور بے غبار حالت میں ہر جگہ مل جائیں گی، لیکن سونے کی کان پتھر کی طرح کھلے عام دستیاب نہیں، بلکہ یہی پتھر اور دوسرے زمینی اجزاء کے تہہ در تہہ غلاف میں سونے کے ذرات چھپا کر رکھے گئے ہیں، ان کی تلاش بھی مشکل ہے، اور تلاش کے بعد ان کو کشید کرنا بھی دشوار، پانی میں سیپ اور اس جیسی کتنی ہی چیزیں تالابوں، ندیوں اور دریاؤں کے کنارے وافر مقدار میں دستیاب ہیں، لیکن موتی کو صدف کے مضبوط غلاب میں چھپا کر رکھا گیا ہے، جو تلاش بسیار کے بغیر ہاتھ نہیں آتا، عورت کا وجود بھی یقیناً ایک پر کشش وجود ہے، جو تاریخ میں بعض بڑی بڑی لڑائیوں کا باعث بنا ہے، تو کیا ان کی حفاظت وصیانت مطلوب نہیں اور ان کو سماج کے رحم وکرم پر چھوڑنا جرم نہیں؟

یہ بات کہ پردہ ترقی کے لئے رکاوٹ ہے، ایک ایسی فرسودہ اور خلاف واقعہ بات ہے کہ نہ عقل اس کی تصدیق کرتی ہے، اور نہ تجربہ، غور کرو کہ علم کی بنیادی طور پر دو ذریعے ہیں ایک انسان کی عقل ہے جس کا مرکز دماغ ہے، اور دوسرے انسان میں کسی محسوس کرنے کی صلاحیتیں ہیں یعنی آنکھ جو دیکھتی ہے، کان جو سنتا ہے، زبان جو چکھتی ہے، ناک جو سونگھ کر کسی چیز کو سمجھتی ہے، اور ہاتھ یا دوسرے اعضاء جو چھو کر کسی چیز کی سختی اور نرمی کو جانتے ہیں، ان ہی پانچ صلاحیتوں کو فلسفہ کی اصطلاح میں ''حواسِ خمسہ'' کہا جاتا ہے، اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا پردہ ان میں سے کسی صلاحیت کو متاثر کر دیتا ہے؟ کیا پردے کی وجہ سے عقل اپنا کام کرنا چھوڑ دیتی ہے؟ اور انسان کی یہ صلاحیتیں مفلوج ہو جاتی ہیں؟ اگر نہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ پردہ کو علمی وفکری ترقی میں رکاوٹ تصور کیا جائے۔

ہاں پردہ ضرور رکاوٹ ہے، بے حیائی اور بے غیرتی میں اس بات میں کہ عورتیں اپنی عفت وعصمت کو قربان کر کے کالبوں کی زینت بنیں، وہ اجنبی مردوں سے ہم دوش

ہوکر رقص وسرور کی بزم میں آراستہ کریں، وہ ماڈل گرل بن کر تجارت کی تشہیر کا ذریعہ بنیں، اپنے عارض وگیسو اور سینہ وبازو کو بے پردہ کرکے تجارت کی ترقی کی خدمت انجام دیں اور جو آفسوں اور دفتروں میں آنے والوں کی نگاہ کے لئے خوان ضیافت بنائی جائیں، یقیناً پردہ ایسی بے ہودہ ''ترقیوں'' میں رکاوٹ ہے، لیکن اگر اسی کا نام ترقی ہے، تو کیا حیوانات اور چوپائے انسان سے زیادہ ترقی یافتہ نہیں ہیں؟؟

(۲۸ر مئی ۱۹۹۹)

عبادت گاہوں کا احترام اور اسلام

خدا کی پہچان اور اس کی محبت انسان کی فطرت میں رکھی گئی ہے، موحد ہو یا مشرک خدا کی صحیح پہچان رکھتا ہو یا حقیقی معرفت سے بے بہرہ ہو، خالق کا پرستار ہو یا خالق کو مخلوق کے قالب میں تلاش کرتا ہو، اور شجر و حجر، آگ پانی کی پوجا کرتا ہو، اس کی تہہ میں خدا کی محبت ہی کارفرما ہے، آتش پرست آتش کدے کیوں سلگاتے ہیں؟ انسان اپنے ہاتھوں سے رنگ برنگ کی خوبصورت مورتیاں کیوں بناتا ہے؟ گرجا گھروں میں ناقوس کیوں بجائے جاتے ہیں؟ یہود اپنی عبادت گاہوں میں گھٹنے کے بل کیوں کھڑے ہوتے ہیں؟ مسجدوں میں اذانیں کس کی طرف پکارنے کے لئے دی جاتی ہیں؟ — یہ سب خدا کی محبت اور اسکی چاہت کے مظاہر ہیں، یہ اور بات ہے کہ اکثر قوموں نے خدا کی حقیقی پہچان کو کھو دیا ہے، اور انہوں نے منزل کے بجائے راستہ اور خالق کے بجائے مخلوق ہی کو اپنا کعبۂ مقصود بنالیا ہے، پیغمبر اسلام دنیا میں اسی لئے تشریف لائے کہ انسانیت کو اس کے حقیقی خالق و مالک کے ساتھ جوڑ دیا جائے اور زندگی کے صحیح طریقوں کے ساتھ ساتھ خدا کی بندگی کا صحیح طریقہ انسان کو بتایا جائے، لیکن بہر حال مختلف قوموں میں عبادت کے جو طریقے مروج ہیں، وہ درحقیقت انسان کی فطرت میں چھپی ہوئی آواز ہے، خدا کی محبت، خدا کی چاہت، خدا کو پانے کا شوق، خدا کو اپنے آپ سے راضی کرنے کا جذبہ، خدا کی چوکھٹ پر اپنی پیشانی کو بچھانا اور اس کے حضور اپنی ضرورت واحتیاج کے ہاتھ اٹھانا، مانگنا، رونا اور گڑ گڑانا، یہ سب انسانی فطرت کا حصہ ہے، اور یہ بجائے خود خدا کے وجود کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

خدا ہر جگہ ہے، اور تہہ تہہ پر اس کی حکمرانی ہے، لیکن خدا کی جو عظمت اور جلالت

شان انسان کے قلب وذہن میں رچی بسی ہے، اس کے تقاضا سے آدمی چاہتا ہے کہ خدا کی بندگی اور اس سے سرگوشی کے لئے پاک صاف جگہ ہو، جہاں سکون ہو، جہاں انسان کی روحانیت مادی آلائشوں سے آزاد رہ سکے اور وہ گھڑی چند گھڑی خدا کے حضور یکسو ہو سکے، اسی مقصد کے تحت ہمیشہ سے ہر قوم اور ہر علاقہ میں عبادت گاہوں کی تعمیر کا ذوق رہا ہے، اس سلسلہ کا آغاز کس عبادت گاہ سے ہوا؟ اس کا جاننا بہت دشوار ہوتا، اگر خود اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کے بارے میں نہ بتایا ہوتا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: سب سے پہلے جو گھر اللہ کی عبادت کے لئے بنایا گیا، وہ ''کعبۃ اللہ'' ہے، جو مکہ میں تعمیر کیا گیا، قرآن مجید میں کعبہ کی تعمیر ابراہیمی کا صراحتاً ذکر موجود ہے، لیکن حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام یا ان سے بھی پہلے فرشتوں نے خدا کے اس گھر کو تعمیر کیا تھا، یہ عبادت گاہ توحید کا مرکز تھی، ہے، اور انشاء اللہ قیامت تک رہے گی، مگر رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قریب دو ڈھائی سو سال پہلے سے لے کر آپ ﷺ کی بعثت کے اکیس سال بعد تک یہ مرکز توحید بت کدہ بنا رہا، لیکن آپ ﷺ نے کبھی اس گھر کی بے حرمتی نہیں فرمائی، مکہ فتح ہونے کے بعد آپ ﷺ نے اس کے بت صاف کر دیئے، اور اس کو اپنی اصل وضع پر لے آئے، لیکن اس کے در و دیوار سے ایک اینٹ بھی نہ کھینچی گئی، اور حالانکہ اس کی تعمیر بناء ابراہیمی سے کسی قدر مختلف تھی، پھر بھی اس کی توقیر و اکرام میں کوئی کمی روا نہیں رکھی گئی، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں عبادت گاہیں کس قدر قابلِ احترام اور لائق رعایت ہیں،

جب بیت المقدس کا علاقہ فتح ہوا تو صورت حال یہ تھی کہ مقام صخرہ کو عیسائیوں نے کوڑا کرکٹ اور نجاستیں پھینکنے کی جگہ بنا رکھا تھا، اور یہ یہودیوں کی عداوت کی بناء پر تھا، کیوں کہ یہود اسی کو اپنا قبلہ بناتے تھے، حد یہ ہے کہ عورتیں اپنے ناپاکی کے کپڑے یہاں ڈالتی تھیں، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ جب بیت المقدس پہونچے اور مسجد اقصیٰ کی بنیاد رکھی تو ''صخرہ'' پر جو مٹی اور گندگی جمع تھی اسے اپنی چادر اور قباء مبارک کے دامن میں رکھ کر منتقل کرنا شروع کیا، اس طرح تمام مسلمان اس کی طرف متوجہ ہوئے اور اس مقام کو گندگی سے صاف کیا،

عیسائیوں کا یہ عمل دراصل یہودیوں کے ردِعمل میں تھا، کیونکہ جس مقام پر حضرت عیسیٰ کو عیسائی عقیدہ کے مطابق سولی دی گئی تھی، اس مقام پر یہود سڑی گلی چیزیں پھینکا کرتے تھے،

(البدایہ والنھایۃ: ۵۶/۷)

رسول اللہ ﷺ نے مذہبی جذبات کی رعایت اور عبادت گاہوں کے احترام کو ہمیشہ ملحوظ رکھا، آپ نے نجران کے عیسائیوں سے جو معاہدہ فرمایا اس میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ نہ کوئی چرچ منہدم کیا جائے گا، اور نہ کسی مذہبی رہنما کو نکالا جائے گا، **لانھدم لھم بیعۃ ولا یخرج لھم قس**، (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۰۴۱) بعض مورخین نے معاہدہ نجران میں یہ دفعات بھی نقل کی ہیں کہ پادریوں راہبوں اور پجاریوں کو اپنے عہدوں سے برطرف نہیں کیا جائے گا، اور نہ صلیبیں اور مورتیاں توڑی جائیں گی،

(مقالات شبلی: ۱۸۹/، بحوالہ (فتوح البلدان: ۶۵/)

شام کا علاقہ فتح ہوا تو حضرت خالد بن ولید نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ، حضرت عمر بن عاص رضی اللہ عنہ اور دو اور صاحبان کی گواہی کے ساتھ دستاویز تحریر فرمائی، جس میں نام بہ نام چودہ گرجوں کا ذکر فرمایا، اور اس کی حفاظت کی تحریری ضمانت دی، (البدایۃ والنہایۃ: ۲۱/۷)۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح مصر کے موقع سے بھی حضرت عمر بن عاص رضی اللہ عنہ نے گرجوں کی حفاظت کے سلسلہ میں دستاویزی معاہدہ کیا تھا، اور ان کو اختیار تھا کہ وہ اپنی عبادت گاہوں کے اندر جس طرح چاہیں عبادت کریں، اور جو کہنا چاہیں کہیں: **ان یخلی بینھم وبین کنائسھم یقولون فیھا مابدالھم** (جمع الفوائد: ۵۰۰/۲، بحوالہ طبرانی کبیر)

مسلمانوں کو ہمیشہ عبادت گاہوں کا اتنا لحاظ رہا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب دمشق کی جامع مسجد میں یوحنا کے نام سے موسوم گرجا کو شامل کرنے کی کوشش کی اور عیسائی اس پر راضی نہ ہوئے تو آپ اس سے باز رہے، لیکن عبدالملک بن مروان نے بہ جبر گرجا کو مسجد میں شامل کرلیا، پھر خلیفہ عادل و راشد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد میں عیسائیوں نے فریاد کی اور اس کا حوالہ دیا، چنانچہ حضرت عمر نے دمشق کے گورنر کے نام حکم جاری فرمایا کہ گرجا کا جو حصہ مسجد میں ملایا گیا ہے وہ انہیں واپس کردیا جائے، آخر مسلمانوں نے

عیسائیوں کی خوشامدیں کر کے بڑی مشکل سے انہیں راضی کیا، اور اس طرح یہ مسجد بچ سکی۔
(فتوح البلدان: ۱۳۱)

مسلمانوں کے عہدِ حکمت میں غیر مسلم اقلیتوں کو نہ صرف اپنی قدیم عبادت گاہوں کو باقی رکھنے کا حق تھا، بلکہ نئی عبادت گاہوں کی تعمیر کی بھی اجازت تھی، مولانا عبدالسلام ندویؒ لکھتے ہیں،

> خود عیسائیوں کو اپنی آبادی میں گرجا بنانے کی ممانعت نہ تھی، چنانچہ جب فسطاط مصر میں عیسائیوں نے ایک نیا گرجا بنایا، اور فوج نے اس کی مخالفت کی تو حضرت سلمہ بن مخلد نے یہ استدلال کیا کہ یہ تمہاری آبادی سے باہر ہے اور اس پر تمام فوج نے سکونت اختیار کیا، (حسن المحاضرہ: ۲/۵) ___ ہارون رشید کے زمانہ خلافت میں مصر کے گورنر عامر بن عمر نے جب عیسائیوں کو گرجوں کے بنانے کی عام اجازت دینا چاہی تو لیث بن سعد اور عبید اللہ بن لہیعہ سے مشورہ لیا، ان بزرگوں نے اس کی رائے سے اتفاق کیا اور یہ استدلال پیش کیا کہ مصر کے تمام گرجے صحابہ اور تابعین ہی کے زمانے کے بنے ہوئے ہیں۔ (ولاۃ مصر: ۱۳۲)

مسلمانوں نے نہ صرف مذہبی عبادت گاہوں کو قائم رکھا اور ان کی تعمیر کی اجازت دی بلکہ عبادت گاہوں کے اوقاف، عہدے اور ان کے وظیفے بھی برقرار رکھے علامہ شبلیؒ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> عمر بن عاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں جب مصر فتح کیا تو جس قدر اراضیات گرجاؤں پر وقف تھیں، اسی طرح بحال رہنے دیں، چنانچہ اس قسم کی جو اراضیات ۱۵۹ھ تک موجود تھیں ان کی مقدار ۲۵ ہزار فدان تھی، (مقالات شبلی: ۲۰۲)

علامہ شبلی نے آگے لکھا ہے:

> "حضرت عثمان کے زمانہ میں مرو کا جو پیٹر پارک تھا، اور جس کا

نام Jesujah تھا، اس نے ایران کے لارڈ بشپ (Simeon) کو جو خط لکھا تھا، اس میں یہ الفاظ تھے، '' عرب جن کو خدا نے اس وقت جہاں کی بادشاہت دی ہے، عیسائی مذہب پر حملہ نہیں کرتے، بلکہ برخلاف اس کے وہ ہمارے مذہب کی امداد کرتے ہیں، ہمارے پادریوں اور خداوند کے مقدسوں کی عزت کرتے ہیں، اور گرجوں اور خانقاہوں کے لئے عطیہ دیتے ہیں'' (حوالۂ سابق: ۲۰۵،۲۰۴)

محمد بن قاسمؒ نے جب سندھ کو فتح کیا تو برہمنوں کے ساتھ خصوصی حسن سلوک تہوار وغیرہ سے متعلق ان کی مذہبی تقریبات اوران کو جو دان اور تحائف ملا کرتے تھے، ان سب کو برقرار رکھا۔ (حوالہ سابق: ۲۰۰۳)

یہ اوراس طرح کے بہت سے تاریخی حقائق ہیں جن سے دوسری قوموں کے ساتھ خالص مذہبی معاملات میں بھی مسلمانوں کی رواداری اور فراخ قلبی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، عبادت گاہ خواہ کسی قوم کی ہو، بہر حال اسے خدا کی عبادت و بندگی سے ایک نسبت ہے، اس لئے اس کی بے حرمتی کو ہرگز روا قرار نہیں دیا جاسکتا، اس سے لوگوں کے گہرے جذبات متعلق ہیں، ایسی ناشائستہ حرکتوں سے پوری قوم کو ٹھیس لگتی ہے، اوران کے قلوب مجروح ہوتے ہیں، اس لئے عبادت گاہوں پر حملہ اوران کی بے حرمتی اسلامی نقطۂ نظر سے انتہائی غیر شریفانہ حرکت ہے، افسوس کہ سنگھ پریوار نے ہندوستان میں بابری مسجد کو شہید کر کے عبادت گاہوں کی بے حرمتی کی ایک نئی راہ دکھادی ہے، اور شر پسند عناصر جذبات سے کھیلنے اور ماحول کو غیر معتدل رکھنے کے لئے اب اسی مذموم طریقہ کا استعمال کررہے ہیں، اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ جو لوگ عبادت گاہوں کے ساتھ زیادتی کے اصل میں مرتکب ہیں وہی مسلمانوں کو انتہاء پسند، اور دہشت گرد کہتے ہیں، اوران پر مذہبی مقامات کی بے احترامی کا الزم لگاتے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے سادہ ذہن غیر مسلم بلکہ ناواقف مسلمان بھی سمجھتے ہیں کہ اسلام ایک شدت پسند اور مذہب کے معاملہ میں بے مروت اور ناروادار مذہب ہے، کاش! لوگ اسلام کو پڑھیں، اور حقائق کو جاننے کی سنجیدہ کوشش کریں! (۲۸ر جولائی ۲۰۰۰ء)

زنا کی سزا — موجودہ سماجی ماحول میں

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو اس طور پر بسایا ہے کہ اس میں انسان کی خواہش کے ایک ایک سامان ہیں، لذیذ سے لذیذ غذا ہے، عمدہ سے عمدہ پانی ہے، آنکھوں کو بھانے والے رنگ برنگ کے پھول ہیں، دل کو رجھانے والے آبشار اور جھیلیں ہیں، حسین سے حسین تر انسان ہے کہ اہلِ ہوس جس کے اسیر زلف ہو کر رہ جاتے ہیں، اور کتنی ہی نعمتیں ہیں جن سے انسان کی طرح طرح کی خواہشات متعلق ہیں! لیکن اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں مفادات وخواہشات اور چاہتوں میں تصادم کی کیفیت رکھی ہے، چیز ایک ہے لیکن طلب گار کئی ہیں، خواہش کسی ایک ما ہی کی پوری کی جا سکتی ہے، لیکن کتنی ہی خواہشات ہیں جو اس ایک شئی سے متعلق ہیں۔

آخرت کا معاملہ اس سے مختلف ہوگا، آخرت کی دنیا میں خواہشات بھی ہوں گی اور ہر خواہش کی تکمیل بھی، اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اتنی وافر مقدار میں ہوں گی اور اتنی یکسانیت کے ساتھ دستیاب ہوں گی کہ کوئی تصادم اور ٹکراؤ نہ ہوگا، اور سب سے اہم بات یہ ہوگی کہ گو جنت میں بھی درجات ومراتب کا فرق ہوگا لیکن ہر شخص کو یوں محسوس ہوگا کہ وہی سب سے بہتر حالت میں ہے، یہ احساس اس کے قلب کو پُر سکون رکھے گا، اور احساس محرومی کا کوئی سایہ بھی اس کے سر سے نہ گذرے گا، جنت میں رہنے والوں کے درمیان نہ کوئی تصادم اور ٹکراؤ ہوگا، نہ باہمی نفرت وعداوت، اور اس لئے وہاں جرم کا کوئی محرک بھی نہ ہوگا۔

اس دنیا میں چوں کہ انسان تصادم اور مسابقت کے ماحول میں زندگی بسر کرتا ہے، یہی ٹکراؤ نفرت وعداوت اور مخالفت کو جنم دیتی ہے، پھر لوگ اپنی خواہشات کو پورا کرنے اور مفادات کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں، اور کچھ لوگ محروم و ناکام، جو محروم

ہوتا ہے یا کیا جاتا ہے، اس کے دل میں انتقام اور تشدد کے جذبات موجزن ہوتے ہیں، اور یہی جذبات جرم کی صورت اختیار کرتے ہیں، دنیا میں ہر طبقہ مفادات میں دوسرے طبقہ سے متصادم ہے، غریبوں کو مالداروں سے گلہ ہے، مزدوروں کو آجرین سے شکوہ ہے، رعایا حاکموں اور فرماں رواؤں سے شاکی ہے، یہ تقسیم دنیا میں ہمیشہ قائم رہے گی کہ اسی سے کائنات کی ہمہ رنگی قائم ہے، اس لئے آخرت سے پہلے ایسی دنیا کا تصور نہیں کیا جا سکتا جو جرم اور جرم کے جذبات سے مکمل طور پر محفوظ و مامون ہو، البتہ جرم کو روکنے کی ممکنہ تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں اور کی جاتی ہیں۔

جرم کو روکنے کے تین محرکات ہیں، اول طبعی شرافت، دوسرے قانون کا خوف، تیسرے آخرت میں جواب دہی کا یقین، اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں اصلاً سلامتی اور صالحیت رکھی ہے، اسی کو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے: کل ولد یولد علی فطرۃ الاسلام، انسان بہر حال اپنی سرشت کے اعتبار سے درندہ نہیں ہوتا، ظلم و جور اور گناہ پر اس کا ضمیر یقیناً اسے کوستا ہے، اسی لئے جرم پیشہ قاتل نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، گناہوں کا احساس ان کا تعاقب کرتا رہتا ہے، ان کی راتیں بے خواب ہو جاتی ہیں، اور بعض پر تو اتنا زیادہ نفسیاتی دباؤ ہوتا ہے کہ وہ خودکشی کر لیتے ہیں، بہت سے انسان وہ ہیں جن کو طبعی شرافت اور ضمیر کی آواز گناہ سے روکے رکھتی ہے، گو وہ اسلام اور کسی اور مذہب کے قائل نہ ہوں، وہ دہریہ کیوں نہ ہو پھر بھی اللہ تعالیٰ نے قلب میں گناہ پر ٹوکنے اور روکنے کی جو صلاحیت دی ہے، وہ اسے تھامے رہتا ہے۔

جرم کو روکنے کا دوسرا موثر ذریعہ قانون ہے، اس دنیا میں جب سے انسانوں کی بستی بسی ہے، وہ کسی نہ کسی قانون کا پابند رہا ہے، بہت سے لوگ جو بے ضمیری میں مبتلا ہیں، اور خدا کے خوف سے بھی عاری ہیں، سوائے قانون کے کوئی چیز نہیں جو ان کے ہاتھ کو تھام سکے، اسلام نے بھی کچھ جرائم کے لئے سزائیں مقرر کی ہیں، اور وہ یہ ہیں، زنا، چوری، زنا کی تہمت، شراب نوشی، راہزنی اور ارتداد، ان سے متعلق سزاؤں کو حدود کہتے ہیں، یہ جرائم اللہ کے حقوق سے متعلق مانے گئے ہیں، اس لئے عدالت یا خود صاحب معاملہ بھی

مجرم کو معاف کرنے کا مجاز نہیں، اسلام کے نظام جرم و سزا میں دوسری اہم چیز ''قصاص و دیت'' ہے، یہ قتل اور جزوی جسمانی مضرت رسانی سے متعلق ہے، اس جرم کو بندوں کے حقوق سے متعلق قرار دیا گیا، اس لئے صاحب معاملہ یا اس کے اولیا، جرم کو معاف کر سکتے ہیں، اور مال کی کسی مخصوص مقدار پر صلح بھی کر سکتے ہیں، ان کے علاوہ جو جرائم ہیں ان کی بابت، عدالت اپنی صواب دید سے سزا کا فیصلہ کر سکتی ہے، اور ملک کی پارلیامنٹ کے لئے بھی ایسے جرائم کے بارے میں قانون سازی کی گنجائش ہے، ان جرائم سے متعلق سزا کو فقہ کی اصطلاح میں ''تعزیر'' کہا جاتا ہے۔

گناہ سے باز رکھنے کا تیسرا سب سے اہم اور سب سے اثر انگیز محرک آخرت کی جواب دہی کا احساس ہے، قانون دن کے اجالے میں انسان کے ہاتھ تھام سکتا ہے، لیکن رات کے اندھیروں اور انسان کے خلوت کدوں تک نہیں پہونچ سکتا، آخرت کی جواب دہی کا احساس ہی ایسی طاقت ہے جو انسان کو اپنی تنہائیوں میں بھی جرم سے باز رکھتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی شخص کی طبیعت مجرمانہ ہو، اور خدا کا خوف اس کے دل میں نہ ہو تو کوئی طاقت نہیں جو اس کو جرم سے روک سکے، وہ اپنی کوتاہ کاریوں کے لئے ہزار تدبیریں نکال لے گا، اور نئے نئے راستے تلاش کر لے گا، اسی لئے قرآن مجید نے جہاں کسی بات سے منع کیا ہے وہاں خوفِ خداوندی اور آخرت کی جواب دہی کی طرف متوجہ فرمایا ہے۔

زنا اسلامی نقطۂ نظر سے ''حدود'' میں شامل ہے، غیر شادی شدہ مردوں کے لئے اس کی سزا سو کوڑے ہے، اور شادی شدہ کے لئے سنگسار کرنا، ظاہر ہے کہ یہ نہایت سخت سزا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ زنا کے نقصانات بھی بہت شدید ہیں، زنا نہ صرف دامنِ اخلاق کو تار تار کرنے اور مذہبی قدروں کو پامال کرنے کے مترادف ہے، بلکہ یہ ایک پورے خاندان کے عزت و آبرو سے کھیلنا اور اس پر ننگ و عار کا ٹیکہ لگانا ہے، جب ایک مرد کسی عورت سے بدکاری کرتا ہے تو یہ فعل عورت کے پورے خاندان کے لئے سماجی اعتبار سے بے عزتی کا باعث سمجھا جاتا ہے، اور اصحابِ شرافت کے یہاں خود اس مرد کے خاندان کے لئے بھی یہ چیز کچھ کم باعث حیاء نہیں ہوتی، زنا کا سب سے زیادہ نقصان پیدا ہونے

والے بچہ کو پہونچتا ہے، وہ باپ سے محروم رہتا ہے، باپ سے محرومی نہ صرف اس کو اپنی شناخت اور میراث سے محروم کرتی ہے بلکہ قانونی طور پر اس کے اخراجات کا کوئی کفیل بھی باقی نہیں رہتا، اگر کنواری لڑکی کے ساتھ دست درازی کی گئی ہو تو اس کے کنوار پن کا ضائع ہو جانا ایسا نقصان ہے جس کی کسی طور تلافی ممکن نہیں، اور اگر وہ شادی شدہ ہے تو یہ اس کے شوہر کے ساتھ بھی زیادتی ہے، کہ اس سے اس کے عزت و آبرو کو صدمہ پہونچنے کے علاوہ قریبی زمانہ میں پیدا ہونے والا بچہ کا نسب بھی مشکوک ہو جاتا ہے، اسی لئے اسلام نے زنا کی سزا نہایت سخت مقرر کی ہے۔

اسلام نے یہ اور اس قسم کے جرائم میں جسمانی سزا مقرر کی ہے، کیوں کہ تجربہ ہے کہ جسمانی سزا مجرم پر جس درجہ اثر انداز ہوتی ہے محض قید سے وہ نتیجہ حاصل نہیں ہو پاتا، بلکہ اعداد و شمار کے تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جن مجرمین کو جیل بھیجا گیا اپنے ہم پیشہ مجرموں کے ساتھ یکجائی کی وجہ سے ان کے جرم کی صلاحیت میں اضافہ ہوا ہے، ۱۹۶۰ء میں مصر میں جرائم کے اعداد و شمار کے مطابق اس سال چوری کے ۷۴۱۹ کیس ہوئے، ان میں صرف ۲۵ رکیس ایسے تھے جن میں مجرم کو پہلی بار یہ سزا مل رہی تھی، باقی تمام ملزمین وہ تھے جو ایک، دو، تین یا اس سے زیادہ دفعہ چوری کی سزا میں جیل جا چکے تھے اور ان میں غالب تعداد ان مجرمین کی تھی جو تین بار سے زیادہ جیل کے چکر لگا چکے تھے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس مجرم نے جتنی سزا پائی اور جتنی بار جیل گیا اپنے ہم پیشہ مجرمین کی صحبت سے اس کے جذبۂ جرم میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ اس کے برخلاف جسمانی سزائیں جرم کو روکنے میں زیادہ مؤثر ثابت ہوتی ہیں، سعودی عرب میں ۷۵ء تک چوری کے صرف ۱۲، ایسے واقعات ہوئے تھے، جن میں ہاتھ کاٹنے کی نوبت آئی، لیبیا میں بھی ایک زمانہ میں قانونِ شریعت کا نفاذ عمل میں آیا تھا، تو تین سال میں صرف چھ مجرمین کے ہاتھ کاٹنے کی نوبت آئی، اس لئے اس میں شبہ نہیں کہ جسمانی سزائیں قتل وغیرہ کسی جرم کو روکنے میں جس درجہ مؤثر ہیں محض قید کی سزا اس درجہ جرم کے سد باب میں مفید نہیں۔

جبری زنا کے سلسلہ میں اس وقت ایک بحث چھڑی ہوئی ہے، ہمارے وزیر داخلہ

شری لال کرشن اڈوانی اور ریاست کے چیف منسٹر جناب چندرابابو نائیڈو دونوں کا رجحان ہے کہ اس جرم کی سزا پھانسی ہونی چاہئے، بعض تنظیموں نے اس کی مخالفت کی ہے، اور بعض مسلم تنظیموں اور شخصیتوں نے اس کی تائید کی ہے، غالباً اس لئے کہ یہ اسلامی نقطۂ نظر سے قریب ہے، لیکن میرے خیال میں یہ مسئلہ اتنا سرسری نہیں، اور کئی نکات ہیں جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے، اول یہ کہ اسلام جب بھی کسی جرم پر سخت سزا متعین کرتا ہے تو اس جرم کو روکنے کے لئے مناسب ماحول بھی تیار کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ جرم کے محرکات اور عوامل کو کم سے کم کر دیا جائے۔ مثلاً یہی زنا کی سزا ہے، تو اس کا دروازہ بند کرنے کے لئے شریعت نے پردہ کے احکام رکھے، محرم اور غیر محرم کے اختلاط کو منع کیا، دفاتر ہوں یا تعلیم گاہیں، یا سواریاں، ہر جگہ اسلامی نقطۂ نظر سے اختلاط کی ممانعت ہے، شراب کو حرام قرار دیا گیا، کیوں کہ نشہ شہوانی تقاضوں کو بے قابو کرنے والی چیز ہے، عورتوں کو برسر عام اپنی زیبائش و آرائش کے اظہار سے روکا گیا، دیدہ زیب، چست اور پُر کشش لباس پہن کر باہر نکلنے کی ممانعت فرمائی گئی، کیوں کہ یہ چیزیں انسانی ہوس کو راستہ دکھاتی ہیں، پھر اس ماحول میں زنا کی سخت ترین سزا رکھی گئی۔ دوسرے جو جرم جتنا شدید ہے اس کے لئے قانونِ شہادت کو بھی اسی قدر سخت بنایا گیا، زنا کے لئے چار عینی مرد گواہوں کی گواہی ضروری قرار دی گئی، بشرطیکہ مجرم کو خود اقرار نہ ہو۔

ہندوستان میں اولاً تو جرم کے محرکات کو کھلی چھوٹ دے دی گئی ہے، فحش فلموں کا بازار گرم ہے، عریاں ویڈیو کیسٹ ملتے ہیں، ٹی، وی نے حیاء کی چادر اتار پھینکی ہے، فحش لٹریچر کا سیلاب ہے، بے شرمی پر مبنی عشقیہ گانے بچہ بچہ کی زبان پر ہیں، بے پردگی اور عریانیت نے پورے ماحول کو مسموم بنا دیا ہے، تعلیم گاہوں سے لیکر دفاتر ایک مخلوط نظام کو اپنی ترقی کی علامت تصور کیا جاتا ہے، شراب عام ہے، اور ایک طبقہ کو زنا کے لائسنس جاری کئے جاتے ہیں، بلکہ غیر شادی شدہ عورتوں سے باہمی رضامندی سے بدکاری کی جائے تو قانون کی نظر میں وہ زنا ہے ہی نہیں، پھر قانون شہادت اتنی بے احتیاطی پر مبنی ہے کہ محض ایک شخص کی گواہی پر بھی اہم سے اہم فیصلے کئے جاتے ہیں، ان حالات میں زنا کی سزا

پھانسی کو قرار دینا میرا خیال ہے کہ کوئی قرین انصاف بات نہ ہوگی، اسی لئے فقہاء نے حدود شرعیہ کے جاری ہونے کے لئے ''دارالاسلام'' کی شرط لگائی ہے، زانی بے شک سخت ترین سزا کا مستحق ہے، لیکن تقاضہ انصاف یہ ہے کہ اس کو جرم سے بچنے کا ماحول دیا جائے، جو ماحول قدم قدم پر گناہ کی دعوت دیتا ہو، اس ماحول میں مجرم کو اس طرح کی سزا دیا جانا یقیناً محلِ نظر ہے، اس لئے حکومت کو چاہئے کہ پہلے ایسے قوانین بنائے جو جرم کے عوامل اور محرکات کو روک سکے، اور ایسے پاکیزہ سماج کی تعمیر ہو سکے جس میں انسان گناہ کی طرف ہاتھ بڑھانے میں سو دفعہ سوچنے پر مجبور ہو، پھر زنا کی قرار واقعی سزا مقرر کرے!

(۱۵ر دسمبر ۱۹۹۹ء)

ذبحِ حیوان ـــ حقائق اور غلط فہمیاں

ادھر چند سالوں سے جیسے بقرعید آتی ہے، فرقہ پرست تنظیمیں حرکت میں آجاتی ہیں اور گاؤ کشی اور جیو ہتیا کے خلاف بیانات شروع ہو جاتے ہیں، بلکہ قربانی کے خلاف ایک مہم سی چلائی جاتی ہے۔ اس سال چوں کہ ۱۰ ذی الحجہ کو ہی ''جین جینتی'' بھی تھی، اس لئے اس مسئلہ کو نسبتاً زیادہ ہوا دینے کی کوشش کی گئی، وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ مرکز میں بی، جے، پی حکومت ہے، گویا چور خود چوکیدار ہے، اس لئے فساد کی آگ سلگنے نہ پائی۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی غذا کے لئے جانوروں کا ذبح کرنا نہ مذہب کے خلاف ہے اور نہ بے رحمی ہے، بلکہ یہ ایک فطری ضرورت ہے اور اس سے بہت سے غریبوں کے معاشی مفادات متعلق ہیں، جس کو نظر انداز کر دینا کسی بھی طرح قرین انصاف نہیں۔ ضرورت ہے کہ غیر مسلم برادرانِ وطن غیر جذباتی ہو کر ٹھنڈے دل سے اس مسئلہ پر غور کریں اور مسلمانوں کا بھی فریضہ ہے کہ وہ جوابی اشتعال کے بجائے دلیل کی زبان میں اپنے غیر مسلم بھائیوں کو سمجھائیں اور ان کو قائل کریں۔

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ اسلام نے گوشت خوری کی اجازت دے کر بے رحمی کا ثبوت دیا ہے، ہمارے بعض ناواقف ہندو بھائیوں کے یہاں تو اسلام نام ہی گوشت خوری کا ہے۔ اس سلسلہ میں اوّل تو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ہندوستانی مذاہب کے سوا دنیا کے تمام مذاہب میں گوشت خوری کی اجازت دی گئی ہے اور گوشت کو ایک اہم انسانی غذا تسلیم کیا گیا ہے، ہندوستانی نژاد مذاہب میں بھی سوائے ''جین مذہب'' کے حقیقت یہ ہے کہ تمام مذاہب میں گوشت خوری کا جواز موجود ہے۔ آج کل ہندو بھائیوں کے یہاں یہ بات مشہور ہوگئی ہے کہ ان کے یہاں گوشت خوری سے منع کیا گیا ہے، لیکن یہ

محض اپنے مذہب اور اپنی تاریخ سے ناواقفیت ہے۔خود ویدوں میں جانوروں کے کھانے، پکانے اور قربانی کا تذکرہ موجود ہے۔رگ وید میں ہے:

اے اندر! تمہارے لئے پسان اور وشنو ایک سو بھینس پکائیں۔(رگ وید۷: ۱۱: ۱۷)

یجر وید میں گھوڑے، سانڈ، بیل، بانجھ گایوں اور بھینسوں کو دیوتا کی نذر کرنے کا ذکر ملتا ہے۔(یجر وید، ادھیائے: ۲۰: ۸۷) منوسمرتی میں کہا گیا ہے:

> مچھلی کے گوشت سے دو ماہ تک، ہرن کے گوشت سے تین ماہ تک، بھیڑیے کے گوشت سے چار ماہ تک اور پرند جانور کے گوشت سے پانچ مہینے تک پتر آسودہ رہتے ہیں۔(منوسمرتی: ادھیائے ۳: ۲۶۸)

خود گاندھی جی نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ایک زمانے تک ہندو سماج میں جانوروں کی قربانی اور گوشت خوری کا عمل عام تھا اور ڈاکٹر تارا چند کے بقول ویدک قربانیوں میں جانوروں کے چڑھاوے بھی ہوا کرتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ گوشت کے انسانی غذا ہونے اور اس مقصد کے لئے ذبحِ حیوان کے جائز ہونے پر نہ صرف یہ کہ مذاہب عالم متفق ہیں، بلکہ تقاضۂ فطرت کے تحت اور عقلی طور پر بھی اس کا حلال ہونا ضروری ہے۔

جو لوگ گوشت خوری کو منع کرتے ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ زندہ وجود کو قتل کرنا ہے، یعنی یہ ''جیو ہتیا'' کا باعث بنتا ہے، لیکن غور کیا جائے تو اس بات کا سمجھنا دشوار نہیں کہ کائنات کا فطری نظام یہی ہے کہ خالق کائنات نے کم تر مخلوق کو اپنے سے اعلیٰ مخلوق کے لئے غذا اور وسیلۂ حیات بنایا ہے۔غور کرو کہ کیا اس جیو ہتیا سے بچنا ممکن بھی ہے؟ آپ جب پانی یا دودھ کا ایک گلاس اپنے حلق سے اتارتے ہیں، تو سینکڑوں جراثیم ہیں جن کے لئے آپ اپنی زبان حال سے پروانہ موت لکھتے ہیں، پھر آپ جن دواؤں کا استعمال کرتے ہیں وہ آپ کے جسم میں پہنچ کر کیا کام کرتے ہیں؟ یہی کہ جو مضر صحت جراثیم آپ کے جسم میں پیدا ہو گئے ہوں اور پنپ رہے ہوں، ان کا خاتمہ کر دیں، پس ''جیو ہتیا'' کے وسیع تصور کے ساتھ تو آپ پانی تک نہیں پی سکتے اور نہ دواؤں کا استعمال آپ کے لئے روا ہو سکتا ہے۔

پھر آج کی سائنس نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ جس طرح حیوانات میں زندگی اور روح موجود ہے، اسی طرح پودوں میں بھی زندگی کارفرما ہے اور نباتات بھی احساسات رکھتے ہیں۔ خود ہندو فلسفہ میں بھی پودوں میں زندگی مانی گئی ہے۔ سوامی دیانند جی نے ''آواگمن'' میں روح کے منتقل ہونے کے تین قالب قرار دیئے ہیں: انسان، حیوان اور نباتات، یہ نباتات میں زندگی کا کھلا اقرار ہے، تو اگر جیو ہتیا سے بچنا ہے تو نباتاتی غذا سے بھی بچنا ہوگا، گویا اس کائنات میں ایسے انسانوں کے لئے کوئی جگہ نہیں جو مکمل طور پر جیو ہتیا سے بچ کر جینا چاہتے ہوں۔

پھر انسانی خوراک کا بڑا حصہ جانور ہی سے پورا ہوتا ہے، بعض بہت ٹھنڈے یا بہت گرم صحرائی علاقے ہیں کہ وہاں کھیتی نہیں کی جاسکتی، وہاں گوشت ہی انسانی غذا کے کام آتی ہیں، پھر خود جسم انسانی میں بعض ایسے عناصر ہیں کہ ان کی کمی کو بغیر گوشت کے پورا نہیں کیا جاسکتا، اس کے علاوہ جانور ایک عمر کو پہنچ کر ناکارہ ہو جاتے ہیں، نہ ان سے دودھ حاصل ہوتا ہے اور نہ وہ کسی اور کام آسکتے ہیں، ایسی صورت میں اگر آپ ان کو غذا بنانے کی اجازت نہ دیں تو مویشی کی پرورش کرنے والوں کے لئے وہ بہت بوجھ بن جائیں گے اور غریب کسان جو خود اپنا پیٹ نہیں بھر سکتے وہ کیوں کر اس بوجھ کو برداشت کر سکیں گے؟

بعض حضرات کہتے ہیں کہ گاؤ کشی وغیرہ کی ممانعت ہم مذہبی نقطۂ نظر سے نہیں کرتے، بلکہ یہ ایک معاشی ضرورت ہے، جانور اگر ذبح نہ کئے جائیں تو لوگوں کو دودھ اور گھی سستے قیمتوں میں فراہم ہوں گے اور عام لوگوں کو اس سے فائدہ پہنچے گا، لیکن یہ محض ایک واہمہ کا درجہ رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جن ملکوں میں ہندوستان سے زیادہ جانور ذبح ہوتے ہیں اور جہاں جانوروں کے ذبح پر کسی قسم کی پابندی نہیں، وہاں بہ مقابلہ ہمارے ملک کے گھی اور دودھ سستے بھی ہیں اور ان کی فراوانی بھی ہے۔ اس کی مثال امریکہ اور یوروپ ہیں۔ ہمارے ملک میں باوجودیکہ بہت سے علاقوں میں ذبح گاؤ پر پابندی ہے اور عام جانوروں کے ذبح کرنے پر بھی خاصی تحدیدات ہیں، لیکن اس کے باوجود یہاں دودھ، گھی زیادہ مہنگے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج دنیا کے مختلف ترقی یافتہ ممالک جانوروں کی افزائش نسل کرکے بڑے پیمانے پر ان کے گوشت برآمد کرتے ہیں اور اس طرح وہ کثیر اقتصادی منافع حاصل کرتے ہیں، اگر ہمارے ملک میں اس پر روک لگادی گئی تو یہ ملک وقوم کو گوشت اور چرم وغیرہ کی برآمدات کے ذریعہ حاصل ہونے والی کثیر آمدنی میں شدید خسارہ کا باعث ہوگی۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ گوشت خوری سے انسان میں تشدد اور اہنسا کا مزاج بنتا ہے اور یہ انسان پر منفی اخلاقی اثر ڈالتا ہے، لیکن دنیا کی تاریخ اور خود ہمارے ملک کا موجودہ ماحول اس کی تردید کرتا ہے۔ آج ہندوستان میں جہاں کہیں ہندو مسلم فسادات ہوئے ہیں اور جن لوگوں نے میرٹھ اور بھاگلپور میں ظلم وستم کا ننگا ناچ کیا ہے، وہ سب کچھ ان لوگوں کے ہاتھوں ہوا ہے جو سبزی خور ہیں اور گوشت خوری کے مخالف ہیں۔ رہنمایان عالم میں شری گوتم بدھ اور حضرت مسیح کو عدم تشدد اور رحم دلی کا سب سے بڑا داعی اور نقیب تصور کیا جاتا ہے، لیکن کیا یہ برگزیدہ شخصیتیں گوشت نہیں کھاتی تھیں، یہ سبھی گوشت خور تھے۔ گوتم بدھ نہ صرف گوشت خور تھے بلکہ دم آخر میں بھی گوشت کھا کر ہی ان کی موت ہوئی تھی اور ہٹلر سے بھی بڑھ کر کوئی تشدد، جوروستم اور بے رحمی کا نقیب ہوگا؟ لیکن ہٹلر گوشت خور نہیں تھا، صرف سبزی کو اپنی غذا بناتا تھا، اس لئے یہ سمجھنا کہ ہنسا اور اہنسا کا تعلق محض غذاؤں سے ہے، بے وقوفی اور ناسمجھی ہی کہی جاسکتی ہے۔ جب تک دلوں کی دنیا تبدیل نہ ہو، انسان انسانیت سے محبت کرنا نہ سیکھے، خدا کا خوف نہ ہو اور آخرت میں جوابدہی کا احساس نہ ہو تو محض غذائیں انسان کے مزاج ومذاق کو تبدیل نہیں کرسکتیں۔

(۲/اپریل ۱۹۹۹ء)

قانون شریعت، رحمت نہ کہ زحمت

ماں باپ اپنے بچوں کی فطرت اوران کی ضروریات سے سب سے زیادہ واقف ہوتے ہیں اور شیر خوار بچوں کے اشاروں کو سمجھنے میں بھی انہیں مشکل نہیں ہوتی، یہ تو خیر انسان ہیں، جانور اور حیوانات، جو گویائی سے بھی محروم ہیں اور جن کو اشارہ کی بھی زبان نہیں آتی، ان کے مالکان اور پرورش کرنے والے بھی ان کی عادات وضروریات سے بخوبی واقف ہوتے ہیں اور اسی لحاظ سے ان کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا انتظام کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ کائنات کا خالق و مالک اس بستی میں بسنے والی تمام مخلوقات اور کائنات کا حاصل ''حضرت انسان'' کی ضروریات، جذبات، مصالح ومفاسد اور عادات واطوار سے اس سے زیادہ واقف ہوگا؛ اس لئے خود خالق کائنات انسان کے لئے جتنے بہتر اُصولِ زندگی اور جتنا مناسب قانونِ حیات وضع کرسکتا ہے، یقیناً کوئی اور طاقت نہیں کرسکتی، نظامِ زندگی کو مرتب کرنے کے لئے علم کی ضرورت ہے اور خدا سے بڑھ کر کوئی علیم نہیں اور اس کے لئے قوتِ فیصلہ اور دانائی مطلوب ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی حکیم نہیں، اسی لئے قرآن مجید نے فرمایا کہ فیصلہ کرنے کا اختیار صرف اسی کو ہے، ''اَلا لَہُ الْحُکْمُ'' (انعام:۶۲)

اللہ تعالیٰ نے جس طرح دنیا میں انسان کے کھانے پینے، لباس و پوشاک اور دوسری ضروریات کا نظم کیا ہے، اسی طرح اس نے انسان کو اپنے نظامِ زندگی کے بارے میں بھی اندھیرے میں نہیں رکھا؛ کیوں کہ ایک شخص یا چند اشخاص کا ایک گروہ پوری انسانیت کے جذبات، ضروریات اور فطری تقاضوں سے آگاہ نہیں ہوسکتا اور اس سے اس بات کی بھی اُمید نہیں کی جاسکتی کہ مختلف انسانی طبقات میں مفادات کا جو ٹکراؤ ہے اور جس سے بحیثیت انسان خود اس کے مفادات بھی متعلق ہیں، وہ ان کے درمیان عدل اور

انصاف سے کام لے سکے گا، اسی لئے خدا کے رب اور رحمٰن و رحیم ہونے کا تقاضا تھا کہ وہ انسان کو زندگی گذارنے اور جینے اور مرنے کا طریقہ بھی بتائے۔

اسی طریقہ کی رہنمائی کے لئے ہر دور میں اللہ کے نبی اور رسول آتے رہے، حضرت آدم علیہ السلام جہاں پہلے انسان تھے، وہیں انسانوں کے بیچ خدا کے پہلے پیغمبر بھی تھے، یہ سلسلہ آخری پیغمبر جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر مکمل ہوگیا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کے لئے جو قانون بھیجا جاتا رہا، اسی کو "شریعت" کہتے ہیں، انسان کا ابتدائی دور چوں کہ علمی اور تمدنی ناپختگی کا تھا؛ اس لئے اللہ تعالیٰ اسی زمانے کے احوال کے لحاظ سے احکام دیتے رہے، پیغمبر اسلام ﷺ اس عہد میں تشریف لائے، جب انسان اپنے تہذیبی، تمدنی اور علمی کمال و پختگی کے مرحلہ میں قدم رکھ چکا تھا؛ اس لئے آپ کو وہ احکام دیئے گئے، جو قیامت تک باقی رہیں گے، جیسے ایک انسان کے جوان ہونے تک جسم میں بڑھوتری جاری رہتی ہے اور سال ڈیڑھ سال پر اس کے کپڑے تنگ ہونے لگتے ہیں؛ لیکن جب آدمی پوری طرح جوان ہو جائے تو اب جسم کی افزائش تھم جاتی ہے اور اس وقت وہ جو بھی کپڑے سلوائے، آئندہ چھوٹے نہیں پڑتے، اسی طرح شریعتِ محمدی اس وقت دُنیا میں آئی، جب انسان کی صلاحیت اپنے آخری مرحلہ پر آگئی، اسی لئے یہ شریعت ہمیشہ کے لئے ہے اور کبھی انسان اس میں تنگ دامانی کا احساس نہیں کرے گا، قرآن کی زبان میں اسی کا نام "اکمالِ دین" اور "اتمام نعمت" ہے۔ (مائدہ:۳)

یہی خدا کا بھیجا ہوا نظامِ حیات ہے، جو "شریعتِ الہامی" یا "اسلامی قانون" کہلاتا ہے، یہ قانون فلاسفۂ یونان کے افکار کی طرح محض "نظریہ" نہیں، جس کا خواب دیکھا جاتا ہے اور اس کی تعبیر کبھی دیکھنے میں نہ آئے اور نہ یہ اشتراکی نظامِ زندگی کی طرح کوئی ایسا قانون ہے کہ ستر سال کی معمولی سی مدت اسے بے نام و نشان کردے؛ بلکہ یہ ایک ایسا متوازن، معتدل اور فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ نظام ہے، جس نے کم و بیش ایک ہزار سال ایشیاء، افریقہ اور یورپ کے بڑے حصہ پر حکمرانی کی ہے، مختلف تہذیبوں اور سماجی اکائیوں کا سامنا کیا ہے اور نہایت ہی خوبی کے ساتھ ہر عہد کے مسائل کو حل کیا

ہے، دنیا میں جب بھی اس قانون کی آزمائش کی گئی، اس کی افادیت قانونِ فطرت سے مطابقت اور امن وسلامتی پیدا کرنے کی صلاحیت کا اعتراف کیا گیا ہے، بدقسمتی سے خلافتِ عثمانیہ، ترکی کے سقوط کے بعد سے اسلام کی حکمرانی کا دائرہ مساجد اور زیادہ سے زیادہ سماجی زندگی کے کچھ مسائل تک محدود کر دیا گیا؛ لیکن آج بھی دُنیا کے بعض ملکوں: سعودی عرب، افغانستان، سوڈان اور ایران میں اسلامی قانون کے اطلاق کو کسی حد تک وسعت دی گئی ہے، وہاں لوگ اس کی افادیت کا احساس کر رہے ہیں اور امن وسلامتی کی ٹھنڈی چھاؤں اسلام کی برکت سے ان کو حاصل ہے۔

اسی احساس نے گذشتہ چند سالوں میں خاص طور پر ایشیاء وافریقہ میں کروٹ لی ہے اور بعض ملکوں میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے لئے رائے عامہ کا اتنا شدید دباؤ ہوا، جسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا، وہاں بتدریج ان قوانین کو نافذ کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں، ایران اور سوڈان اس کی مثالیں ہیں، ان دونوں ممالک کو تو عرصہ سے بنیاد پرستی اور رجعت پسندی کا طعنہ دیا ہی جارہا تھا، جب طالبان نے افغانستان میں حیرت انگیز فتوحات پائیں اور ایک ایسے ملک کو، جو سخت بدامنی اور غارت گری کا شکار تھا، امن سے سرفراز کیا اور وہاں کے باشندوں نے محسوس کیا کہ وہ بہت عرصہ کے بعد لاقانونیت اور خانہ جنگی سے امن وامان اور قانون وآئین کی طرف واپس ہوئے ہیں، تو پھر ایک نیا پروپیگنڈہ شروع ہوا اور ذرائع ابلاغ میں ان کی تنگ نظری اور کوتاہ فکری کے افسانے تراشے جانے لگے۔

ابھی دو تین ہفتہ پہلے اچانک وزیر اعظم پاکستان جناب نواز شریف نے شریعت بل کا اعلان کیا، جس کے تحت پاکستان میں قرآن وحدیث کو سب سے بالاتر قانون تسلیم کیا جائے گا، یہ اعلان کس قدر اخلاص پر مبنی ہے؟ اس کا علم تو خدا ہی کو ہے! یہ ملک اسلام ہی کے نام پر بنا اور اسلام ہی کا نام لے کر مختلف حکمرانوں نے اقتدار کی سیڑھیاں طے کیں؛ لیکن حقیقی صورت حال یہ ہے کہ پاکستان میں وہ پرسنل لا تک محفوظ نہیں، جس کو کسی درجہ ہندوستان میں دستوری تحفظ حاصل ہے، بظاہر اس قسم کا اعلان محض حکمرانوں کی گرتی ہوئی

ساکھ کو اونچا اٹھانے کی ایک تدبیر ہے، تاہم بعض دفعہ شر سے بھی خیر پیدا ہوتا ہے، اگر اس بہانہ بھی یہ بل پاس ہو جائے تو ایک خوش آئند بات ہوگی۔

لیکن اس اعلان نے بھی ایک بار مغرب اور مشرق کو چونکا دیا اور بعض لوگ اس طرح اس کے خلاف پروپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ گویا کوئی خوفناک زلزلہ یا طوفان آنے والا ہے، حد یہ ہے کہ ہمارے ملک کی بی جے پی گورنمنٹ، جو خود 'رام راج' کا نعرہ لگاتی ہے اور ہندو راشٹر کا خواب دیکھتی ہے، وہ بھی اسے مذہبی بنیاد پرستی کا نام دے رہی ہے، اس طرح کے بیانات سے عام لوگوں میں غلط فہمی کی فضاء قائم ہوتی ہے اور لوگ سمجھنے لگتے ہیں کہ واقعی یہ کوئی ''ڈراؤنی'' چیز ہے؛ حالاں کہ اگر حقیقت پسندی سے کام لیا جائے تو یہ ایک اچھی خبر ہے، نہ کہ بری اور انسانیت کے مفاد میں ہے، نہ کہ ان کے لئے نقصان اور پریشانی کا باعث۔

اسلامی شریعت کا اصل امتیاز دو باتیں ہیں: عدل اور اعتدال، عدل سے مراد یہ ہے کہ ہر آدمی کی ذمہ داری اس کی صلاحیت کے لحاظ سے متعین کی جائے، جیسے ملک کا دفاع، امن و امان کا قیام اور اس طرح کی ذمہ داریاں مردوں سے متعلق ہوں گی؛ کیوں کہ وہی اس کی صلاحیت رکھتے ہیں، اُمورِ خانہ داری کی انجام دہی اور بچوں کی پرورش عورتوں کے ذمہ رہے گی؛ کیوں کہ وہ ان کاموں کو زیادہ بہتر طور پر انجام دے سکتی ہیں، اعتدال سے مراد یہ ہے کہ حقوق و فرائض کی تعیین میں افراط و تفریط نہ ہو جائے، جیسے یہی خواتین کے حقوق کا مسئلہ ہے، بعض قوموں نے عورتوں کو اس درجہ گرایا کہ ان کو انسانیت کی آخری صف میں بھی جگہ نہیں دی اور بعض نے اتنا اونچا اٹھایا کہ جن ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کی صلاحیت ان میں نہیں تھی، وہ ذمہ داریاں بھی ان سے متعلق کر دیں، یہی حال مزدوروں کے معاملہ میں ہوا، کچھ لوگوں نے مزدوروں کو سرمایہ داروں کا زر خرید غلام بنا دیا اور کچھ لوگوں نے کہا کہ حکمرانی مزدوروں ہی کا حق ہے، اس افراط و تفریط نے ہمیشہ سماج کو نقصان پہنچایا ہے، شریعتِ اسلامی کا اصل امتیاز یہی ہے کہ ہر شعبۂ زندگی میں اس کے قوانین تقاضۂ عدل کو پورا کرتے ہیں اور افراط و تفریط اور بے اعتدالی سے پاک ہیں، خود حدود و

قصاص کے قوانین، جو جرائم اور سزاؤں سے متعلق ہیں، کو بنظر انصاف دیکھا جائے تو نہایت متوازن اور قانونِ فطرت سے ہم آہنگ ہے۔

عام طور پر ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ اسلامی قانون قریب ڈیڑھ ہزار سال پرانا ہے، اس درمیان دُنیا کتنی ہی معاشی، سماجی اور سیاسی تغیرات سے گذر چکی ہے، جو انسان بیل گاڑیوں پر سفر کرتا تھا، اب ہوا کے دوش پر اُڑتا ہے اور سمندر کی تہوں میں غواصی کرتا ہے، ایسے فرسودہ عہد کے قوانین اس ترقی یافتہ اور متمدن عہد کے لئے کیوں کر کفایت کر سکتے ہیں؟ لیکن یہ خیال محض غلط فہمی پر مبنی ہے، دراصل انسان سے دو چیزیں متعلق ہیں: ایک اس کی فطرت، دوسرے وہ وسائل و ذرائع، جو اس کے چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں، غور کیا جائے تو جو کچھ تبدیلیاں نظر آتی ہیں، ان سب کا تعلق اسباب و وسائل کی دُنیا سے ہے، انسان کی فطرت اور اس کے اندرون میں کوئی تبدیلی نہیں، پکوان کے طریقے ضرور بدل گئے ہیں، کھانے پینے کا ڈھنگ ضرور بدلا ہے؛ لیکن بھوک و پیاس جیسے ہوتی تھی ویسے اب بھی ہے، انسان نے تلوار اور تیر کی جگہ ایٹم بم اور میزائیل بنالیا ہے؛ لیکن اس کے پس پردہ جو جذبۂ انتقام و مدافعت پہلے کارفرما تھا، اب بھی یہی حال زندگی کے تمام شعبوں میں ہے۔

اسلامی قانون کا اصل موضوع انسانی فطرت ہے، نہ کہ اسباب و وسائل، وہ انسان کی فطری خواہشات اور جذبات کو کنٹرول کرتا ہے اور اس کی رہنمائی کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ طاقت کا استعمال ظلم کو دور کرنے کے لئے کرو، نہ کہ خود ظلم کرنے کے لئے، وہ کہتا ہے کہ دولت غریبوں کے گھر چراغ روشن کرنے پر صرف کرو، نہ کہ اپنی بڑائی کے اظہار کے لئے، وہ چاہتا ہے کہ انسان اپنی ذہنی اور فکری قوت انسان کی فلاح و بہود کے لئے خرچ کرے، نہ کہ انسان کے لئے ہلاکت خیز وسائل کی ایجاد میں، وہ چاہتا ہے کہ ذرائع ابلاغ کا استعمال سچی حقیقتوں کے اظہار اور سچائی کی مدد کے لئے ہو، نہ کہ جھوٹے پروپیگنڈے اور سچائی کو دبانے کے لئے؛ اس لئے جوں جوں وسائل و اسباب کی دُنیا میں ترقی ہوتی جائے گی، اسلامی قانون کی اہمیت اور ضرورت بھی اسی نسبت سے بڑھتی جائے گی، یہی وجہ کہ آج دنیا کا کوئی قانون نہیں، جس نے اسلام سے خوشہ چینی نہ کی ہو، خاص کر سماجی قانون میں تو

اسلامی قانون سے اتنا فائدہ اٹھایا گیا ہے کہ اس کا شمار نہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جہاں کہیں اور جس قدر اسلامی شریعت سے اعراض اور گریز کا راستہ اختیار کیا گیا، وہاں اسی قدر لوگ مشکلات کا سامنا کر رہے ہیں۔

اس لئے اسلامی شریعت کا نفاذ ایک رحمت ہے، نہ کہ زحمت، اس سے نہ کسی کو خطرہ ہے اور نہ اس پر دُنیا کو اندیشہ میں مبتلا ہونے کی ضرورت، حقیقت یہ ہے کہ اسلام سراپا رحمت اور امن وسلامتی ہے، مسلمانوں کے لئے بھی مسلم ممالک کی غیر مسلم اقلیتوں کے لئے بھی اور ان کے پڑوسیوں کے لئے بھی، خدا کرے کہ کچھ مسلم ممالک اس بات کے لئے تیار ہوں کہ وہ اپنی زمین پر صرف خدا کی رضا کے لئے قانونِ شریعت کو اس کی تمام وسعتوں کے ساتھ، مصلحت اور حکمت کی رعایت کرتے ہوئے نافذ کریں، اگر واقعی انہوں نے ایسا کیا تو یہ ایک ایسا تجربہ ہوگا، جس سے دنیا سبق لے گی اور بہت سی زبانیں جو محض عناد اور حسد سے کھلتی ہیں، گنگ ہو جائیں گی!

(۲/۱ اکتوبر ۱۹۹۸ء)